قرۃالعین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

تحقیقی مقالہ برائے

پی۔ایچ۔ڈی
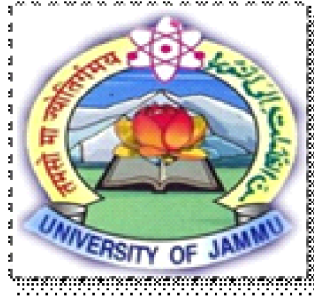
مقالہ نگار : نگراں

محمد علی شہباز : پروفیسر شہاب عنایت ملک

شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں توی ۱۸۰۰۰۶

۲۰۱۶ء

Qurat-ul-ain Hyder ki takhliqat mein quomi Yakjahti aur apsi baichara kay anasar

A THESIS

SUBMITTED TO THE UNIVERSITY OF JAMMU

FOR THE AWARD OF DEGREE OF

DOCTORATE OF PHILOSOPHY

IN URDU
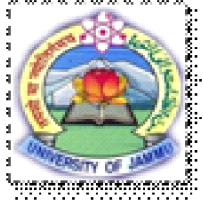
Submitted by — **MOHD ALI SHAHBAZ**

Supervisor — **Prof. SHOHAB INAYAT MALIK**

DEPARTMENT OF URDU

University of Jammu, Jammu-180006

2016

فہرست ابواب

پیش لفظ

بیسویں صدی میں جن ادیبوں نے فکر وفن کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا اور اپنی شناخت سب سے الگ اورمنفرد بنائی اُن میں قرۃ العین حیدر کانام سب سے اہم اورنمایاں ہے ۔ بڑے بڑے ادیبوں اورقلم کاروں نے قرۃ العین حیدر کے اس فکر وفن سے متاثر ہوکر بہت سی تخلیقات وجود میں لائیں مگر وہ سب حیدر کے فن کے آگے پھیکی نظر آئیں ۔قرۃ العین حیدر ادبی وعلمی دنیا میں جن بلندیوں پر پہنچی وہ بلندیاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔تقریباً ساٹھ سال تک ایک بے مثال فن کار کی حیثیت سے وہ اُردو کے اُفق پر جلوہ گر رہیں۔

قرۃ العین حیدر نے نثر کی تقریباً تمام اصناف میں گراں قدر اضافہ کیا جن میں ناول، ناولٹ، افسانے ، رپورتاژ خاکے ، مضامین ،خطوط، ترجمہ وتالیف، بچوں کا ادب وغیرہ شامل ہیں۔ ان اصناف میں انہوں نے زندگی اورزمانے کے تمام مسائل وحقائق کو موضوع بنا کراپنی تخلیقات میں پیش کیا اوران ہی موضوعات میں سے ایک اہم موضوع قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے عناصر ہیں جن کوقرۃ العین حیدرنے تقریباً اپنی تمام

تخلیقات میں برتا اور یہ ان کا پسندیدہ موضوع رہا۔انہوں نے اپنی جتنی بھی تخلیقات وجود میں لائیں ان میں کسی نہ کسی طرح قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کوشامل کیا۔

قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کی فہرست بہت لمبی ہے ناولوں میں میرے بھی صنم خانے ، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا ، گردشِ رنگِ چمن، آخر شب کے ہمسفر ، کارِ جہاں دراز ہے، چاندنی بیگم وغیرہ ہیں۔ ناولٹ میں دلربُ با، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو ،سیتا ہرن اور چائے کے باغ ہیں۔ افسانوی مجموعوں میں ستاروں سے آگے ، پت جھڑ کی آواز ، روشنی کی رفتار ، شیشے کے گھر ہیں۔ رپورتاژ میں دو مجموعے کوہ ودماوند اور ستمبر کا چاند ہیں۔ خاکوں کے دو مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں جن میں داستان طرز اور پکچر گیلری،خطوط کا مجموعہ دامانِ باغبان اس کے علاوہ مضامین ، ترجمے بچوں کاادب، مرتب کتابیں وغیرہ غرض یہ کہ نثر کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اوراعلیٰ معیاری تخلیقات وجود میں لائیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی ان تمام تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ حیدر جس ماحول میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی وہ ماحول مشترکہ ہندومسلم اتحاد کا ماحول تھا۔لیکن یہ سب قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے دن بدن ختم ہوتا جارہا تھا۔ یہاں تہذیبی قدروں میں گراوٹ آتی جارہی تھی۔ حیدر چاہتی تھیں کہ آپسی بھائی چارہ ملک کی ایکتا کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے محبت ،نفرت ، مذہبی کٹرپن اور بے رحمی کے بارے میں بہت غور کیا۔ انسان کی انسان کی جانب بے رحمی، تقسیم کا مسئلہ اوراس تقسیم میں انسانوں کا قتل عام ۔ انسانیت کا

قتل عام حیدر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس قتل وغارت سے ان کا خاندان تباہ وبرباد ہوا۔ مذہبی کٹر پن کو وہ بہت ناپسند چیز تصور کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جابجا اُن سب باتوں کی مذمت کی ہے جس سے قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے پر آنچ آئے ۔ لہٰذا اسی نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے ''قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ، جیسے موضوع کا انتخاب کیا ہے ۔ اصول تحقیق کے مطابق میں نے اپنے مقالے کو درج ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کے عنوان سے ہے ۔ اس باب میں، میں نے حیدر کے ناولوں میرے بھی صنم خانے ، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا ، گردشِ رنگِ چمن، آخر شب کے ہمسفر ، کار جہاں دراز ہے ، چاندنی بیگم میں موجود ایسے عناصر کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جس سے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ ظاہر ہو۔

مقالے کے دوسرے باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو پیش کیا ہے جن میں دلربُا ، سیتاہرن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو ، چائے کے باغ شامل ہیں۔ان ناولٹوں میں قومی یکجہتی کے عناصر کو مثالوں کے ذریعے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

مقالے کا تیسرا باب قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کے نام سے ہے اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے

ستاروں سے آگے ، پت جھڑ کی آواز ، شیشے کے گھر ، اور روشنی کی رفتار میں شامل ایسے افسانوں کی نشاندہی کی ہے جس میں حیدر نے مشترکہ تہذیب کی عکاسی کی ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں قرۃ العین حیدر کی دیگر تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو پیش کیا ہے۔ ان تخلیقات میں رپورتاژ، خاکے، مضامین، ترجمے وتالیف ،خطوط وغیرہ میں شامل عناصر کو حقائق اور دلائل کے ساتھ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

پانچواں باب حاصل مطالعہ کے عنوان سے مقالے کی تلخیص پیش کی گئی ہے اور آخر میں بنیادی اور ثانوی ماخذات کے تحت ان کتب ورسائل کی فہرست دی گئی ہے جو دوران تحقیق میرے مطالعہ میں آئے اور جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

سب سے پہلے میں رب پروردگار کا شکرگذار ہوں کہ اس نے مجھے اتنی توفیق دی کہ میں اس مقالے کو تکمیل تک پہنچا سکا۔ اس کے بعد میں اپنے استادِ محترم اور نگراں پروفیسر شہاب عنایت ملک (صدر شعبۂ اُردو وڈائریکٹر کشتواڑ کیمپس) کا شکرگزار اور احسان مند ہوں جنہوں نے میرے اس مقالے کی تکمیل میں نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ اور مجھے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ میں شعبہ کے دیگر اساتذہ کا بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں اور خصوصاً ڈاکٹر ریاض احمد صاحب کا جو اپنے قیمتی مشوروں سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میں اپنے شعبہ کے دیگر غیر تدریسی عملے کا اور شعبۂ کی لائبریرین عظمت چوہدری کا بھی ممنون ہوں جو وقتاً فوقتاً میری مدد فرماتے رہے۔

میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرہی نہیں سکتا جن کی دعاؤں اور مدد سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔البتہ دعا گو ں ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور مجھے ان کی خدمت کرنے کی توفیق دے ۔ میں اپنے برداران اور ہمشیروں کا بے حدممنوں ہوں جن کومیں اورجو مجھے بے حدعزیز ہیں۔ میں اپنے شعبہ کے اسکالرز کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن میں ڈاکٹر اعجازحسین شاہ، ڈاکٹر آصف ملک، جاوید احمدمغل، ڈاکٹر ارشاد، ذاکر،ظہیر، اوصاف، قیوم ملک، اوتار سنگھ ،مظفر چوہدری ودیگر تمام کاشکرگزار ہوں جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔

شکریہ
محمدعلی شہباز
پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر
شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی

باب اوّل

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں
قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

ناول اطالوی زبان کے لفظ ''ناویلا'' سے نکلا ہے جس کے معنی نئے کے ہیں۔ انسان پرانی کہانیوں سے اور خصوصاً فرضی کہانیوں سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ جب ناول سے اس کی واقفیت ہوئی تو یہ صنف اس کو نئی اور انوکھی لگی اور اس میں انسانی زندگی کی حقیقت اور زندگی کے سارے روپ اس کو دیکھے لہٰذا اِسی مناسبت سے اس نئی صنف کا نام ''ناول'' پڑا۔ ناول سے پہلے داستان کا رواج تھا اور داستان میں کہانی در کہانی ہوتی ہے۔ شروع سے آخر تک داستاں میں ایک ہی کہانی نہیں ہوتی بلکہ ایک کہانی بیان کرتے ہوئے کئی کہانیاں اس میں بیان کی جاتی ہیں۔ ناول میں عموماً داستان کے برخلاف شروع سے آخر تک ایک ہی کہانی اور کردار ملتے ہیں۔ ناول میں حقیقی زندگی سے منسلک کہانی پیش کی جاتی ہے۔

ہمارے اردو ادب میں ناول انگریز کے توسط سے آیا۔ مولوی نذیر احمد نے اردو ادب میں اس صنف کی بنیاد ڈالی اور ''مراۃ العروس'' کو اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ نذیر احمد کے بعد عبدالحلیم شرؔر، مرزا ہادی رسوؔا، پنڈت رتن ناتھ سرشاؔر نے اس صنف کی آبیاری کی۔ اس کے بعد پریم چند کا نام آتا ہے جنھوں نے اس صنف میں تمام طرح کے مسائل مثلاً سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات اور خاص کر دیہاتی زندگی کے مسائل کی اپنے ناولوں میں ترجمانی کی۔ پریم چند کے ساتھ یلدرم، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار وغیرہ اس دور کے اہم ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ترقی پسند ادیبوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالستار اور قرۃ

العین حیدر کا نام آتا ہے۔ ان قلمکاروں نے ایک سے بڑھ کر ایک ناول تخلیق کئے۔

قرۃ العین حیدر اکیسویں صدی کی بڑی ناول نگار ہیں جنہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک معیاری ناول تخلیق کئے۔ ان ناولوں میں، میرے بھی صنم خانے، شفینۂ غم دل، آگ کا دریا، گردش رنگ چمن، آخر شب کے ہمسفر، کار جہاں دراز ہے، (تین جلدیں) اور چاندنی بیگم ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ان ناولوں میں ہندوستانی تہذیب کو موضوع بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ اوران کی تہذیبی نشو ونما کی تاریخ پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اس ہندوستانی مشترکہ تہذیب میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو قرۃ العین حیدر نے جابجا اپنے ان ناولوں میں برتا ہے جس کی تفصیل آئندہ صفات میں درج ذیل ہے۔

میرے بھی صنم خانے (1949ء)

میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول اُنہوں نے تقسیم ہند کے دوران لکھا اور 1949ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ ناول اس لحاظ سے بھی قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ اُن کا پہلا ناول تھا اوراس وقت اُن کی عمر صرف20 سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ ناول فنی وتکنیکی لوازمات پر بھی کسی حد تک کھرا اُترتا ہے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' اردو ادب کا پہلا مکمل ناول ہے جس میں قرۃ العین حیدر نے انگریزی ناولوں کی تکنیک اختیار کی۔ ناول کا موضوع یوں تو اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے مگر اس میں ایک بات جابجا ہمیں جو دیکھنے کوملتی ہے وہ ہے قومی یکجہتی اور آپسی

بھائی چارے کے عناصر۔ اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب، فرقہ واریت ، طبقاتی کشمکش وغیرہ بھی دیکھنے کوملتی ہے۔'' قرۃ العین حیدر نے اس ناول کا عنوان اقبالؔ کی غزل کے اس شعر سے لیا ہے۔

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم

خانے

دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کو قرۃ العین حیدر نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے باب کا نام ''چلی جائے موری نیا کنارے کنارے'' ہے جس میں قرۃ العین حیدر نے صرف کرداروں کو متعارف کروایا ہے۔ دوسرے حصّے کا نام ''دھستے ہوئے ساحل'' ہے ۔جس میں کہانی کا آغاز اور کہانی پھیلتی ہے اور عروج تک پہنچی ہے۔ تیسرے حصّے کا نام ''منزل لیلیٰ'' ہے جہاں سمندر میں طوفان آنے کے بعد کا حصہ ہے ۔ اس ناول کی کہانی کا آغاز پہلی جنگ عظیم یعنی 1939ء سے شروع ہوتا ہے اور 1947ء تک کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

رخشندہ بیگم اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کا مرکزی کردار ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم ، کنور عرفان علی، کرن، ول، ڈائمنڈ ، حفیظ احمد، سید افتخار ، چوہدری شمیم، پولو، پسی چو، کنور دانی، سلطنت آرا بیگم اس ناول کے معاون کردار ہیں۔ جو ہندو ، مسلم ، عیسائی سبھی قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' کا موضوع اودھ کی زوال پذیر تہذیب ہے جس کی قرۃ العین حیدر نے بھرپور عکاسی کی ہے۔ اودھ کی تہذیب ہندوستان میں اپنے مشترکہ کلچر، قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے بہت مشہور ہے اور ظاہر ہے کہ جب اُس تہذیب کے متعلق کوئی تخلیق وجود میں آئے گی تو اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں ضرور دیکھنے کو ملیں گے۔ اس ناول کو قرۃ العین حیدر نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں اُس وقت لکھا جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی۔

''میرے بھی صنم خانے'' کا مرکزی کردار رخشندہ اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طبقے کی تمام روایات واقدار سے مزین اور تمام مشاغل کی شائق Intellectual کردار ہے۔ رخشندہ بیگم کو دورِ حاضر کے مطابق ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ تعلیم کے معاملے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ڈانس کلب جاتی ہے۔ سائیکل چلاتی ہے۔ آرٹ سے انگریزوں کی طرح دلچسپی رکھتی ہے اس کے پریوار کے لوگوں کے دوست اوراس کے بھائیوں کے تمام دوست اس کے بھی دوست ہیں غرض یہ کہ اعلیٰ طبقے کی تمام سہولیتیں اسے میسر ہیں جو اسے ورثے میں ملی ہوتی ہیں۔ رخشندہ اوراس کے ساتھیوں نے اپنا ایک رسالہ''نیوایرا'' نکالا ہے جس میں سیاست دانوں پر کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ اس قوم کے ایک بڑے لیڈر سید افتخار علی ہیں جو رخشندہ سے بھی اور اس کے رسالے سے سخت نالاں ہیں۔ انہوں نے رخشندہ کے رسالے کے مقابلے میں اپنا ایک رسالہ''ملتِ بیضا'' نکالا ہے۔ رخشندہ اپنی گھر والوں اور اپنی ماں سے بالکل مختلف ہے وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود کسی قسم کے بھید بھاؤ والی نظر نہیں رکھتی لیکن انسان

دوہرے رویوں کا حامل ہے دوسری طرف سید افتخار علی جو''ملتِ بیضا'' کی ڈور سنبھالے ہوتے ہیں، کے ذریعے اس طبقے کی سوچ کو اس طرح واضح کرتا ہے۔

''گومتی کے کنارے سے واپس گھر پہنچ کر سید افتخار علی سوچ رہے ہیں کہ یہاں کا بھی عجیب ہی حساب نظر آتا ہے۔ انہوں نے اندازہ لگانا چاہا تھا کہ اس شہر کی تعلیم یافتہ ترقی پسند نوجوان حلقے کی اکثریت کس طرف جارہی ہے اور اُنہیں یہ دیکھ کر تعجب ہورہا تھا کہ ان راجاؤں اور تعلقداروں کے لڑکے اور لڑکیوں سے لیکر متوسط طبقے اور پڑھے لکھے نچلے طبقے تک سبھی اپنے آئیڈیلز کے لئے متحد ہیں۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فرقہ وارانہ پارٹیوں اور گروہوں کی وہاں پر کمی نہ تھی اور وہ خوب زور پکڑ چکے تھے لیکن یہ حلقہ ان سب سے الگ تھلگ دوسروں کو گالیاں دیئے اور اپنا پروپگنڈہ کرنے کے بجائے خاموشی اور خلوص سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ ملک کی ایک بڑی قومی جماعت کے ترقی پسند عناصر سے ہمدردی رکھنے والے اس گروہ میں سرمایہ دار بھی تھا، بورژوا بھی اور پرولتاری بھی۔ لیکن کوئی یوزیئر نہ تھا فریب دینے والا نہ تھا'' [1]

''میرے بھی صنم خانے'' کی کہانی تمام افراد کے مشاغل، ان کے کاموں ان کی دلچسپیوں اور ان کے معاشقوں سے اور حالات کی بے رحمی سے گذر کر آگے بڑھتی ہے۔ ناول کے دوسرے حصے ''دھنستے ہوئے ساحل'' میں تمام لوگوں کو مختلف جذبوں سے گذر کر علمی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے اوران حالات کا شکار ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ حالات آہستہ آہستہ خود بخود بدل رہے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ ان کا اثر یہاں بھی پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ ترقی پسند کے اثرات بھی آہستہ آہستہ

مرتب ہورہے ہیں۔ سماج میں تبدیلیاں آرہی ہیں ۔ فرقہ وارانہ فسادات جنم لئے رہے ہیں۔قومی تہذیب کا مسئلہ بنا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ انسان انسان کا قتل عام کررہا ہے جس کی مثال رخشندہ کچھ اس طرح بیان کرتی ہے:۔

''ماروگولی یہ انسانیت ہمیشہ سے دم توڑتی آئی ہے ۔ کہیں اور پانچ چھ ہزار جانداروں نے ایک دوسرے کو مار ڈالا۔ رخشندہ نے بےفکری سے سوچا۔''[۲]

رخشندہ کے بھائی کوفرقہ واریت میں ماردیاجاتاہے۔ ہرطرف افراتفری کا ماحول ہے وقت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے ۔ ملک تقسیم ہوا ۔مہاجرین اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔قافلے بے بہارا ، خستہ حال، نامعلوم منزل کی طرف جارہے ہیں۔کوئی کسی کا پرسش حال نہیں ہے۔ بےحسی کے حال میں سبھی چل رہے ہیں۔ پیدل، ٹرین اوربیل گاڑیوں پر لوگ سفر کررہے ہیں۔ ہرطرف نفسی نفسی کاعالم ہے ۔اس انسانی تہذیب کی ٹریجڈی کا اس ناول میں یوں منظر پیش کیا ہے :۔

''پرانی دنیاختم ہوچکی تھی۔ جو کچھ باقی تھا وہ اس وقت بےکسی اتنا حماقت زدہ تھا ،ایسا مجبور تھا کہ دنیا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔تہذیب کے مرکزوں اورگہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کیلئے صحراؤں کی طرف نکل گئے ۔امام باڑے ویران اورمسجدیں شکستہ ہوگئیں۔

پرانے خاندان مٹ گئے ۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اورنفرت کی آندھی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ایک عالم تہہ وبالا ہوگیا۔

وہ تہذیب ہندوؤں مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد، روایات
وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا۔''[۴۳]

رخشندہ جس تہذیب کی بیٹی تھی۔ اس تہذیب پر بڑی گہری چوٹ لگتی ہے۔ اس کی انا محروج ہوتی ہے۔ گردش زمانہ انسان کے مقدر کو لکھنے پر قادر ہے۔ تیرے حصے ''منزل لیلیٰ'' میں پی چو مارا گیا، خورشید اپنے مارکسزم سے تائب ہوکر انگریزی فوج میں شامل ہوجاتا ہے۔ کرن بھی مارا گیا اور رخشندہ تنہا رہ جاتی ہے۔ غفران منزل کے حالات بھی ویسے نہ رہے۔ وقت کی گردش کا شکار ہوگئے چوہدری شمیم رخشندہ سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر رخشندہ انکار کردیتی ہے اور کنور رانی چوہدری سے شادی کر لیتی ہے۔ مہندم ہوتی ہوئی تہذیب مشترکہ کلچر بھائی چارگی کا المیہ مکمل ہوجاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں جہاں مٹتی ہوئی تہذیب کو پیش کیا ہے وہاں انہوں نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر جو اس وقت مشترکہ لوگوں میں موجود تھے پیش کرنے سے کوئی گریز نہیں کیا۔ مختلف کرداروں کے ذریعے اس ناول میں مشترکہ تہذیب کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''ہم نے اکٹھے مل کر نیلے پہاڑوں پر صبح کاذب کی خوبصورتی دیکھی ہے ہم نے ایک ساتھ تاریک جنگلوں اور ہری پگڈنڈیوں کو طے کیا ہے۔ ہم اور تم ان کنجوں میں گھومے ہیں جہاں کوئلیں سندھیا کے نغمے گاتی ہیں۔ تم اب کہاں پہنچے ہو۔ تم اب کیا سوچ رہے ہو۔ تم وقت کو اپنے میں کھونا چاہتے ہو۔ ہم وقت سے الگ

ہیں۔ ہم وقت سے الگ ہیں۔ ہم وقت سے آگے نکل آئے
ہیں۔ کیا تمہاری آتما کا برہما ابھی تک شانت نہیں ہوا۔ ہم تو اس
بڑی خوبصورت دنیا میں جاگرتی پھیلانے آئے تھے۔''[۱۴]

مندرجہ بالا مثال میں قرۃ العین حیدر نے واضح کیا ہے کہ انسان چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہوا سے انسانیت کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے ۔ یہ انسان جب جوان ہوتا ہے تب اس کو ایک طرح سے سمجھ، سوجھ بوجھ آتی ہے مگر انسان جو غلطیاں اور بدگمانیاں جوان ہوکر کرتا ہے وہ بچپن میں جب وہ ناسمجھ ہوتا ہے کبھی بھی نہیں کرتا ۔قرۃ العین حیدر نے کرداروں کے ذریعے بتایا ہے کہ جب وہ بچے تھے تب کیسے مل جل کرر ہتے تھے ۔ کہاں کہاں گھومتے تھے ، کن کن جنگلوں اور پہاڑوں کی سیر کرتے تھے ۔ اور جب سوچ سمجھ آئی تب اس قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی دھجیاں اڑائی۔''ہم آگے نکل آئے ہیں'' اس سے کیا مراد قرۃ العین حیدر نے دینی چاہی ہے کیا بچپن سے آگے یا انسانیت سے آگے یا حیوانیت کی طرف ۔قرۃ العین حیدر بھی بچپن میں مشترکہ تہذیب میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی اور جب جوان ہوئی تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے انسانوں کا نہیں بلکہ انسانیت کا خون بہتے اورانسانیت کی بے حرمتی ہوتی دیکھی ۔جس کو انہوں نے اس ناول جو 1947ء میں لکھ رہی تھی۔ بڑی بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ ایک جگہ اور مصنفہ کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے :۔

'' جو(Make belive) کی دنیا اس سب نے اپنے لئے
تخلیق کی تھی وہ اس میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے یہاں

تک آ پہنچے تھے اوراب یہاں سے اپنے اپنے راستے آگے جانے والے تھے۔''۵؎

'' وہ ایک پرُسکون زندگی کا بےضرر سا پرزہ تھے ۔ان کی ذات سے نقصان کسی کو نہ تھا۔ فائدہ ہزاروں کو تھا۔ان کے چند خاص اصول تھے خاص عقیدے اور نظرے تھے، روایات ، وضعداری اور ان کا تحفظ ان کے نزدیک ان کا عزیز ترین فریضہ تھا۔ انہیں چند چیزوں سے بے پناہ نفرت تھی ۔مثلاً وہ ان حقیر نو دولتوں کا ناقابل وجود کسی طرح برداشت نہ کرسکتے تھے جنہیں اب تکلفاً اوپر یا متوسط طبقہ کہاجاتاہے ۔ انہیں متوسط طبقے سے چڑتھی۔ اس طبقے نے ہر جگہ ہر ملک میں ، ہر زمانے میں گڑ بڑ پھیلائی ہے۔ بڑی بڑی گستاخانہ جراتیں کی ہیں۔ اس لڑائی جھگڑتی ،خود غرض، کاروباری ………… دنیا میں سب سے الگ تھلگ، صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب ، پرانی روایات کے ورثے کے لئے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف ہوائیں بہت تیز ہیں کہاں کی تہذیب اورکہاں کی وضعداری؟ یہ چراغ جو دوقوموں کے ثقافتی سنگم اورتمدن ہم آہنگی نے صدیوں سے روشن کر دکھایا ہے کوئی دم میں بجھا چاہتا ہے لیکن اس چراغ کی مدھم روشنی نے ان رنگ محلوں میں جو دھندلا سا اجالا بکھیر رکھا تھا وہی بہت

بڑا جذباتی سہارا تھا۔''۶

اس اقتباس سے یہ بات واقع ہوجاتی ہے کہ قرۃ العین حیدر کو قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو زک پہنچانے والے عناصر سے سخت نفرت تھی۔ قرۃ العین حیدر نے نہ صرف قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے اپنا قلم اٹھایا بلکہ مشترکہ تہذیب کو نقصان پہنچانے والے کے بھی سخت خلاف تھی اوران کی سخت الفاظ میں مذمت کرتی ہیں جس کی واضح مثال اوپر دی گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر درمیانہ طبقہ کو اس لئے نشانہ بناتی ہیں کہ درمیانہ طبقہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کونقصان پہنچاتا ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ قرۃ العین حیدر کو اپنی پرانی تہذیب سے بڑا لگاؤ رہاہے اوراس کی ہرجگہ حمایت کرتی ہوئی اس ناول ''میرے بھی صنم خانے میں نظر آتی ہیں۔ حیدر نے آگے بنایا ہے کہ کس طرح دوقومیں صدیوں سے یہاں میل جول اورآپسی بھائی چارگی سے رہتی تھی اوررہنا چاہتی ہیں مگر چند ایک غلط عناصر اس سب کو برباد کرنے چاہتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اس قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی وجہ سے جو روشنی تھی وہ ان کے لئے بڑا جذباتی سہارا تھا ۔ قرۃ العین حیدر نے ان چندر سطور میں ہماری ہندوستانی سماج کے کروڑوں لوگوں کے دلوں کی آواز کو بلند کیا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہاں ہندوستان میں رہنے والے ہندو مسلم ایک ساتھ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کے ساتھ رہتے تھے اور رہنا چاہتے ہیں مگر چند ایک عناصر جن کوانہوں نے متوسط طبقہ کہا ہے انہوں نے کس طرح اس صدیوں کے اتحاد کوتوڑا اور ایک دوسرے کے بیچ ایک خلیج بنائی ۔

قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں تمام مذہب کے کردار موجود ہیں انہوں نے اس

ناول میں ہندو مسلم عیسائی تمام مذہب کے لوگوں کو پیش کر کے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ان کے ہاں اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں عیسائی کردار بھی موجود ہیں جو اپنے طریقے سے اپنے تہوار مناتے ہیں مثلاً کرسمس وغیرہ اور دوسرے تمام مذاہب کے لوگ ان کے ہاں شریک ہوئے ہیں ایک جگہ ناول میں حیدر یوں رقمطراز ہیں:۔

> '' پھر بھی یہ لڑکی ۔ یہ کالی آنکھوں والی اسنو وائف جو کرسمس کے جشن میں خوب شور مچانے ، کئی گھنٹے ناچنے اور کریکرز کھینچنے کے بعد اطلس کے لحاف میں ناک چھپائے سو رہی تھیں۔ اینڈ رسٹ کی دنیا ان کی ہری وادیوں میں مزے سے اپنے جیون بتائے جا رہی تھی جہاں پھول کھلتے تھے اور برکھا کی ٹھنڈی فواریں برستی تھیں۔ وہ پرانی روایتوں کے پس منظر میں غفران منزل کے قدیم صحرایوں کے نیچے پروان چڑھتے تھے۔''ے

قدیم صحرایوں سے یہاں قرۃ العین حیدر کی مراد قدیم مشترکہ روایت تہذیب اور بھائی چارگی ہے جو صدیوں سے یہاں کی تہذیب یہاں کے کلچر کی پہچان تھی۔ قرۃ العین حیدر نے ماضی کی مثالیں دے کر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ قائم کرنے کی کوشش بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ آگے واعظانہ طور پر کرداروں کے ذریعے حیدر کہتی ہیں کہ وہ دنیا وہ پرانی دنیا ختم ہو چکی ہے اور جو کچھ باقی بچا ہوا ہے وہ اس قدر بے حس اور اتنا حماقت زدہ ہے کہ دنیا اس کا مذاق اڑا رہی ہے ۔ حیدر کہتی ہیں کہ تہذیب کے مرکزوں میں پلنے

والے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ پرانے تہذیب کدے ویران ہوگئے۔ امام باڑے ویران ہوگئے مسجدیں ویران ہوگئی اور اس سے بڑھ کر آگے کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:۔

''پرانے خاندان مٹ گئے زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک عالم تہہ وبالا ہوگیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اورتمدنی اتحاد وروایات، وہ زمانہ سب ختم ہوگیا۔''[۸]

1947ء سے پہلے ہزاروں سال پرانی تہذیب یہاں کی جس میں آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود تھے اس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ خود اس مشترکہ تہذیب میں پلی بڑھی تھی وہ خود اس تہذیب کا حصہ تھی۔ اس لئے وہ اپنے ناولوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب قرۃ العین حیدر نے ہوش سنبھالا اس وقت چند ایک عناصر مشترکہ تہذیب کو زک پہنچا رہے تھے اورآہستہ آہستہ وہ اس سازش میں کامیاب بھی ہوئے اورنتیجے کے طور پر ملک تقسیم ہوگیا اس بات کا احساس قرۃ العین حیدر کو شدت سے تھا۔

انگریزوں نے ہندوستان پر دو ڈھائی سو سال حکومت کی یہاں کی دولت کو لوٹا یہاں کے لوگوں پر ظلم وزیادتیاں کیں طرح طرح کے طریقوں سے یہاں کی دولت اور جائیداد کو نقصان پہنچایا۔ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو نقصان پہنچایا مگر پھر بھی یہاں کے لوگ ان کے ساتھ بھائی چارہ بنا کر رکھتے تھے اس کی کئی مثالیں بھی قرۃ العین

حیدر نے اپنے اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں دی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح یہاں کے لوگ انگریزوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ یہاں اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں ایک کردار حفیظ احمد کی بیوی کرسٹابل کو جب رخشندہ انگلستان روانہ کرنے کے لئے بمبئی آئی ہے اور جب اس کو الوداع کرتی ہے تو کرسٹابل کچھ اس طرح سے الوداع کرتی ہے:۔

''............خداحافظ............ اُنہوں نے کہنا چاہا............ خدا حافظ برطانیہ کی کرسٹابل ڈورین............ ہم تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم تمہارے جلانے کے لئے لالہ رُخ اورغفران منزل کے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے جی بھر کے تمہاری قوم کو گالیاں دیا کرتے تھے، اب تم جارہی ہو اس لئے کہ ہم نے تمہیں نظرانداز کر کے خود ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کردی ہیں۔لیکن کرسٹابل ڈورین ......انہوں نے کہنا چاہا''9؎

ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب سے انگریز بھی بہت متاثر ہوئے مندرجہ بالا سطور میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب کرسٹابل رخشندہ کے گھر میں آتی تھی تو یہ سب لوگ ان کی خاطر کرتے تھے حالانکہ کرسٹابل کو جاتے وقت اس بات کا احساس ہوگیا کہ میں غلط کرتی تھی ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا مگر یہ سب یہاں کی بھائی چارگی سے متاثر ہوکر کرسٹابل کہتی ہے کہ میں تم لوگوں کے دل جلاتی تھی۔کسی بات کا اعتراف کرلینا ہی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے اور قرۃ العین حیدر نے کردار کرسٹابل کے ذریعے یہ بات انگریزوں

سے بھی قبول کروائی کہ وہ غلط کرتے تھے ۔ کرسٹابل یہاں ایک عورت ہی نہیں بلکہ پورے انگریز طبقے کی نمائندہ کردار اور نمائندہ عورت ہے۔

وقت کا فلسفہ قرۃ العین حیدر کا محبوب فلسفہ رہا ہے جو'' میرے بھی صنم خانے'' اور اس کے بعد آنے والے تمام ناولوں میں اس فلسفہ کو مخصوص موضوع کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے ۔ یہاں کچھ مثالیں ہیں قرۃ العین حیدر کی جو انسانوں کو وقت کے ذریعے نصیحت دینے کی کوشش کرتیں ہیں:۔

''ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوسکتے ۔ نئے دن آتے ہیں نئی راہیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے ، آندھیاں اٹھتی ہیں کسی کو موت آتی ہے ، کسی کو نہیں آتی نیند بھی نہیں آتی۔ یہ چکریوں ہی چلتا رہے گا۔'' [۱۰]

ایک اور جگہ آگے یوں رقمطراز ہیں:۔

''زندہ رہنے کی خواہش ، خوش رہنے کی خواہش ، زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے ،معصوم ، بے بس انسان ،آنے والے دن اور آنے والی راتیں ان سب کے لئے کیا لائیں گی؟ ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی ؟ ان کے دل کیوں دھڑکیں گے؟ کوئی نہیں جانتا یہ سب کیوں ہے؟ ارے میں تو فلسفی ہوگئی ہوں بڑی بھاری، اس

نے سوچا۔''[۱۱]

وقت ارجن کے خدا کی طرح اپنے شاہکاروں کو خود تباہ کر دیتا ہے ۔مگر وقت ابدیت سے علیحدہ صرف مستقبل پر بھروسہ رکھتا ہے اور مستقبل میں اگر ایسی بن جائے جس میں ہمیں اتنی تمنا ہے تو پھر کوئی بات ایسی ہوگی ، کوئی وجہ ایسی نکل آئے گی جس سے انسانیت کی ساری کوششیں بیکار جائیں گی ۔[۱۲]

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پہلی جنگ عظیم سے لیکر تقسیم ہند تک کے دور کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس لئے تقسیم ہند سے پہلے یہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں دیکھنے کو ملتے تھے مگر جب ملک تقسیم ہوا اور یہاں خون کی ہولی کھیلی گئی بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہوگیا۔اس وقت کے جتنے بھی ادیب قلم کار تھے انہوں نے اپنی قلم کے ذریعے اس بات کی شدید مذمت کی اور اپنی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو سب نے برتا ۔قرۃ العین حیدر بھی ان میں سے ایک تھی لہٰذا انہوں نے اس ناول کے ذریعے جہاں سماج کے ٹھیکیداروں پر کڑی تنقید کی وہی اپنی تخلیقات میں اور خصوصاً اس ناول جو اس وقت زیر قلم تھا کہ ذریعے کچھ اس طرح قومی یکجہتی اور آپسی بھائی کے عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی:۔

''سب اسی دھرتی کے بیٹے تھے ۔ ان کی زبان ، ان کا لب ولہجہ ان کے گیت ان کے دکھ سکھ ، وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے ، یہ سب اس کا اپنا تھا۔اس کا اپنا اور بہت پیارا ، اپنی زمین اپنی گیہوں کی بالیاں ، ہوا کی نمی ، مٹی کی خوشبو ، یہ سب اس کی اپنی مٹی

کے دیوتا تھے۔''[۱۳]

مندرجہ بالاسطور سے واضح ہوجاتا ہے۔ کہ اس دھرتی سے ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو بہت پیار کرتا تھا۔ اس کو اپنی اس مٹی سے کتنی محبت تھی یہاں قرۃ العین حیدر نے کسی مذہب یا کسی فرقے سے تعلق رکھنے والے انسان کونہیں بتایا بلکہ ان کی مراد یہاں کے شہری تھے ۔ یہاں کے لوگوں کے گیت سانجھے تھے یہاں کی زبان سانجھی تھی ۔ یہاں کے لوگوں کے پکوان ایک تھے ۔ ظاہر ہے جب سب کچھ ایک جیسا ہوگا تو ملک میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ ہوگا ۔ تقسیم ہند سے پہلے یا اورتھوڑا پہلے اگر ہم انگریزوں کی آمد سے پہلے دیکھیں تو ہمیں مشترکہ تہذیب کے عناصر ملتے ہیں کہیں پر بھی لڑائی ، فتنے ، فساد مذہبی سطح پر ہمیں دیکھنے کونہیں ملتے تھے ۔ ہندو مسلم سب مل جل کر رہتے تھے جس کو قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:۔

> ''یہاں کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کون ہندو ہے ، کون مسلمان ہے ، کون شیعہ ، کون سنی ہے اپنے دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود زندگی بڑی مکمل ، پر مسرت اور قانع تھی ۔ پرانی روایات کی پابندی اور قدیم چلن کو نبھانا سب کا مقدس فریضہ تھا۔''[۱۴]

اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کو اس ناول میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اودھ کی مشترکہ تہذیب اور بھائی چارگی پورے ملک میں بہت مشہور رہی ہے اور آج بھی ہے ۔ فسادات کے وقت میں بھی وہاں کچھ حد تک لوگوں نے اس بھائی چارگی کو قام رکھنے کی کوشش کی

جس کو قرۃ العین حیدر نے اودھ کے وفادار کائستھ لالہ اقبال نرائن کے ذریعے اس ناول میں پیش کیا ہے جس کو اپنے دشتہ دار مسلمانوں سے ناطہ توڑنے اور مسلمانوں سے تعلقات نہ رکھنے کی دھمکیاں دیتے ہیں مگر لالہ پر ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ فسادات کے وقت وہاں مسلمانوں کے بھرپور مدد کرنا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی ایسے واقعات ہوتے ہیں جس کے ذریعے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لالہ اقبال نرائن جیسے اور کتنے کردار ہوں گے جنہوں نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی روایت کو برقرار رکھا ہوا۔ قرۃ العین حیدر کے اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔

سفینۂ غم دل (۱۹۵۲ء)

قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل'' ہے جو ۱۹۵۲ء میں مکتبہ جدید لاہور سے پہلی بار شائع کیا گیا۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول بھی قرۃ العین حیدر کے پہلے ناول ''تیرے بھی صنم خانے'' کی طرح اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور تقسیم ہند کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ناول میں ہمیں کثیر تعداد میں کردار ملتے ہیں مگر ایک بات جو ہمیں اس میں ملتی ہے وہ ہے مصنفہ خود بھی واحد متکلم ''میں'' کے کردار کے ذریعے اس ناول میں موجود ہے جو کہانی سناتے ہوئے ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ ربط و تسلسل کی اس ناول میں کمی دکھائی دیتی ہے۔

ناول کی ابتداء اس وقت ہوئی ہے جب انگریز کردار ایلمر وریکسٹن بچپن میں رہنے

والا ایڈگر کے ساتھ ہندوستان میں آتا ہے اور پھر یہاں کی آب وہوا اورمشترکہ تہذیب بھائی چارگی سے متاثر ہوکر یہاں کے معاشرے کواپنالیتا ہے۔

ناول کے اہم کرداروں میں ایلمر ڈیکسٹن ،ادون، میرا،علی،مس اسٹیلا لیلیٰ،فواد، ریاض الدین ہیں۔قرۃ العین حیدر کے کردار زیادہ تر اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ناول میں اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اس ناول میں بھی ''میرے بھی صنم خانے'' کی طرح اودھ کے اعلیٰ خاندان کی مٹتی ہوئی اقدار کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول ''سفینۂ غم دل'' میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بدلے ہوئے حالات میں جب زمیندار اور جاگیردرانہ نظام اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھاان کی جگہ نئے معاشرے جنم لے رہے تھے نیا سماج نئے لوگ شامل ہورہے تھے پہلے ہندو اورمسلم سماج یہاں حکومت کررہا تھا اُن کی بول چال تھی ان کی جگہ انگریزوں نے نئ اس کے بعد کہیں اور یہ سب نظام منتقل ہورہاتھا جس میں عیسائیت بھی شامل ہورہی تھی جس کی مثال قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں یوں پیش کی ہے:

> ''شدھ، سناتن دھرم ہندوؤں کے بازار ،مسلمان جو لاہوں کے محلوں ، انگریز حکام کی کوٹھیاں ، دریا کے پرے ان سب پر صبح کی کاسنی دھند چھائی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کی طویل عمارات ، سارناتھ کا ابدی سکوت ،جونپور اورقنوج کے تیز سرخ گلابوں کے تختے ،آم کے باغات ۔''۱۵؎

یہاں اس ناول 'سفینۂ غم دل' میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پہلے تو یہاں ہندومسلم ہی

رہتے تھے مگر آہستہ آہستہ انگریز بھی یہاں کی تہذیب میں داخل ہوتے ہیں وہ یہاں اپنی کو ٹھیاں بھی بنواتے ہیں اوراعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ تعلقات بہت اچھے رکھتے ہیں حالانکہ اُن کا ہندوستان پر قبضہ کرنے کا مقصد تھا مگر یہاں پر اُنہوں نے بھائی چارہ بھی بنایا ان کے حق میں مفید تھا لہٰذا انگریز حکمرانوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں یہاں کے رسم ورواج یہاں کے رہن سہن کو اپنایا اور اس ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا حصہ بننے کوشش کیں۔ انگریز بھی یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے سے بہت حد تک متاثر ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اس بھائی چارے پر سیاست رچائی اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور یہاں کے بھائی چارے کو انہوں نے توڑا اور نتیجتاً ملک تقسیم ہوا، تہذیب تقسیم ہوئی یہاں کا سب کچھ تقسیم ہوا اورقومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کونقصان پہنچا۔ جس کی مثالیں قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں بھی موجود ہیں۔

بنیادی طور پر انگریز حکمرانوں کو یہاں کی تہذیب یہاں کے کلچر اور یہاں کی عوام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بلکہ دلی طور پر وہ یہاں کے عوام سے نفرت کرتے تھے مگر تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ کرنا اُن کی مجبوری تھی۔ بعض انگریز کو یہاں کے لوگوں سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ ہندوستان میں رہنا پسند بھی نہیں کرتے تھے جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''ان ہندوستانی رجواڑوں کے مسخرے پن سے مسز کیتھلین
چیو کو وحشت ہوتی ہے۔''١٦

سفینۂ غم دل میں قرۃ العین حیدر نے جس طبقے کی عکاسی کی ہے اس میں دوطرح کے لوگ رہتے تھے اس میں ایک فیوڈل طبقہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام ختم ہو وہ برابر انگریزو کی حمایت کرتا تھا وہ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے اور دوسری طرف اسی طرح کا ایک طبقہ آزادی کی جد وجہد میں حصہ لے رہا تھا وہ انگریزوں کی سخت مخالفت کرتے تھے اورعدم تعاون کی تحریک چلا رہے تھے ۔ یہ سب لوگ مل جل کرقومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ یہ کام کررہے تھے ان میں مذہب وملت کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ مگر انگریزوں نے نہ ہی تو ان لوگوں کی کچھ پرواہ کی جو انکے ساتھ چلتے تھے اور نہ ہی جدو جہد آزادی والوں کی ، انہوں نے صرف ''دوقومی نظریہ'' کے تحت قوم کو تقسیم کیا اور یہاں اس سازش میں وہ کامیاب بھی ہوگئے اور صدیوں سے چلی آرہی مشترکہ تہذیب کا انہوں نے بٹوارا کردیا۔ مصنفہ اس بات کو کرداروں کے ذریعے یوں پیش کررہی ہیں:۔

> ''پھر یک لخت ساری فضا دھوئیں سے معمور ہوگئی ،بلوائیوں کی ہاہا کار ، زخمیوں اور دہشت زدہ انسانوں کی چیخیں، زندگی روشنی اور امید کا خاتمہ ،محض تباہی ۔ دم گھوٹ دینے والے دھویں کے بگولے ہی زندہ ہیں۔ مدھم اجالا تھا۔ جس میں رفتہ رفتہ سارا منظر عیاں ہوگیا۔ دماغ جو ماؤف ہوگیا تھا کام کرنا شروع کیا۔ یہ سامنے جلے راکھ کے ڈھیر پڑے ہیں۔ یہ'' آشیانہ'' جیسے میرے باپ نے مدتیں گذری بڑے چاؤ سے تعمیر کروایا تھا اور آج وجون ہے اور

آج اس سے بالآخر ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ لیا۔ ۱۷

پرانی روایات پرانی قومی یکجہتی مشترکہ تہذیب اور بھائی چارے کی جو مثالیں تقسیم سے پہلی ملتی تھی وہ سب ختم ہوگئی ۔سب فنا ہوگیا ہاں صرف اتنا رہا کہ ان سب باتوں کو یاد کیا گیا جس کو قرۃ العین حیدر نے بھی کچھ اس طرح سے رقمطراز کیا ہے:

''یہ وہ لوگ تھے جن کے ماحول کا اثر اور ٹون قائم رکھنے کے لئے نقرئی شمع دان میں جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں دعوتیں ہوتی تھیں۔ اور غالب و ناسخ کے ایک شعر پر بحث کرنے میں ساری رات گذار دی جاتی تھی۔'' ۱۸

دوسری جگہ لکھتی ہیں:

''یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے ۔ باوقع خوشحال اور باعزت ۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے ۔ رنج اور خوشیاں مسائل یکساں تھے ۔ ان کے فرنیچر اور باغوں کے پودے ۔ ان کی کتابیں، ان کے لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم ان کے نام ان کی دلچسپیاں۔'' ۱۹

مندرجہ بالا مثال سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر بہت زیادہ تھے ۔ اس مثال میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کلچر زبان ، مکان، لباس، کھانے ، رسم ورواج سب ایک تھے مشترکہ تہذیب تھی جس کی نمائندگی قرۃ العین حیدر کرتی رہی ہیں اور جس میں مثالیں قرۃ العین حیدر کے اس

ناول ''سفینۂ غم دل'' میں آگے جا بجا ملتی ہیں۔ ایک اور جگہ آگے یوں رقمطراز ہیں:۔

''رضا بھائی کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو خود کو گوپال اور ملہر پور ہردار دونوں جگہ کا کرشن کنہیا تصور کیا گیا۔ ان کے علاوہ کنبے کے تقریباً سارے افراد قصبے سے باہر مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ لیکن رضا بھائی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پرانی سرائے کی گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے اور رام گنگا کے گھاٹ پر آنے والی کہارنوں اور ہیرنوں کے ساتھ راس لیلا رچاتے پروان چڑھے۔ بڑی دھوم دھام اور اللہ آمین کے ساتھ ان کو پہلے لامارٹیز پھر کالوں پر علی گڑھ بھیجا گیا۔''[۲۰]

قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''سفینۂ غم دل'' میں رضا کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہاں کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ مندر اور مسجد میں کوئی خاص فرق اس کردار نے نہیں سمجھا۔ باقی پریوار والوں کی پرواہ کبھی نہیں کی کیونکہ یہ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثال تھی۔

رضا کے علاوہ بھی اور کتنے کردار ہیں جو مشترکہ تہذیب کی یہاں کی مٹی کی بات کرتے ہیں جن کو اپنی زمین مسجد مندر سے کم پیاری نہیں تھی اس بات کو ایک اور کردار ''علی'' کے ذریعہ قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے۔ جب ملک تقسیم ہوگیا۔ مسلمان پاکستان کی طرف جانے لگے اور ہندو وہاں سے ہندوستان کی طرف آنے لگے اس دوران کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی زمین اپنی جنم بھومی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک جہاں وہ پیدا

ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ عزیز ہے ۔ خواہ وہ زمین کتنی بھی بنجر کیوں نہ ہو۔ اس کو ''علی'' کے ذریعے کچھ یوں پیش کیا ہے:۔

> ''میں امن پرست ہوں۔ میں امن پسند ہوں۔ علی نے تقریباً چلا کر جواب دیا۔ ابھی یہ کس نے شور مچایا تھا۔ تحفظ امن عامہ میں خلل اندازی ؟ ایک اور افسر کے قریب آ کر پوچھا .... یہاں سے آگے جاؤ .... لیکن میں علی ہوں۔ اس نے ضد سے دہرایا ۔ کون............؟ تب تو تم کو قطعی دفعہ ہوجانا چاہئے ...... کدھر جاؤں............ آفیسر نے سیاہ روشنی میں مغرب کی طرف اشارہ کیا ۔ وہاں اُدھر جہاں اور سب جا چکے ہیں۔ لیکن یہ میری زمین ہے اس پر میرا خون گر چکا ہے ۔ اس کے لئے میں نے اپنا خون بہایا ہے ۔ تم نے میرے زخموں کو نہیں دیکھا؟ اُس نے اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔''[۲۱]

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے ''سفینۂ غم دل'' میں بتانے کی کوشش کی ہے کہ جہاں انسان پیدا ہوتا ہے وہ جگہ اُس کو کتنی عزیز ہوتی ہے ۔ بچپن کے دوست ، بچپن کے ساتھی خواہ وہ کسی بھی مذہب ، ملت ، فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں ان سب چیزوں سے انسان کی کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔ وہ بنیادی طور پر امن پرست ہوتا ہے ۔ جبھی تو ''علی'' اپنی زمین، دھرتی چھوڑ کر کہیں اور جانے کو تیار نہیں ہوتا ۔ اس کو اپنی وطنیت ، قومی یکجہتی پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوتا ۔ پھر بھی دوسرے اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنی دھرتی

سے دور دوسری جگہ جانے کو کہا جاتا ہے جس کے لئے وہ راضی نہیں ہوتا ۔ جب یہاں ہمارے ملک میں آزادی کے لئے جدو جہد چل رہی تھی تب یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ دیکھنے لائق بنتا تھا جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول ''سفینۂ غم دل'' میں بہت جگہ بتانے کی کوشش کی ہے جس کی مثال کچھ اس طرح سے ہیں:۔

'' پہلی جنگ عظیم کے بعد اور زیادہ دلچسپاں اور مسائل پیدا ہوئے۔ مثلاً قومی عدل تعاون وغیرہ ان بیگمات نے اپنے اطلسی فرشی پائجامے اور بنارسی ساڑیاں ترک کر کے کھدر پہنا شروع کیا ۔'' ۲۲

اس ناول ''سفینۂ غم دل'' میں مصنفہ نے بار بار لکھنؤ کا ذکر کیا ہے اور ہر بار وہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اس کہانی میں بیش کرنے کی کوشش کی ہے آگے ایک جگہ یوں کہتی ہیں:

''یہ نیا لکھنؤ تھا لیکن آئرن برج کے بیاد فسانہ آزاد، مرزا رسوا اور اودھ شیخ کا لکھنؤ بھی ابھی زندہ تھا۔ ان کی زندگیوں میں اداسی اور مایوسی تھی لیکن یہ وہ خوش باش لوگ تھے جو اپنے دکھوں کے باوجود دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے ۔ جو کبیر کے دوہے اور انیسؔ کے شعر پڑھتے عمر بتا دیتے اور مرتے وقت بھی ضلع جگت سے باز نہ آتے ۔'' ۲۲

ایک اور جگہ آگے یوں رقمطراز ہیں:

''اس حسن کا ذہنی تجربہ ناممکن ہے یہ منظر ابدی اور لازوال ۔
کوئی ہم سے یہ صبح، یہ موسم، یہ کھنکارتے ہوئے براہمن یہ بچھوئے
بجاتی لڑکیاں یہ الوہی سکون کے ساتھ ٹہلتی ہوئی گائیں، یہ مناظر
چھین سکتا ہے۔......نہیں''۲۴

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں کے لوگ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے اور قومی یکجہتی ان میں تھی۔ براہمنوں اور علماء کی قدر اورعزت ہر طبقے کے افراد کرتے تھے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم یا سکھ عیسائی۔ مگر اس حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقسیم کا ڈر ہر طبقے کو ستا رہا تھا اور وہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب جو ہماری وراثت ہے ہماری تہذیب ہے ہماری بھائی چارگی ہے یہ کوئی بھی ہم سے نہیں چھین سکتا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم۔

قرۃ العین حیدر کے اس ناول ''سفینۂ غم دل'' میں مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی اس تخلیق میں بھی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔ جن کے پڑھنے سے آپسی بھائی چارہ اور مشترکہ تہذیب کی حس انسان میں پیدا ہوتی ہے ۔ چونکہ قرۃ العین حیدر جس طبقے میں پیدا ہوئیں اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی صدیوں سے چلی آرہی تھی اور جس معاشرے میں انہوں نے پرورش پائی اس سے قرۃ العین حیدر کو یہ مشترکہ تہذیب ورثے میں ملتی تھی۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں برتا ہے۔ اوراس ناول سفینۂ غم دل میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

آگ کا دریا (۱۹۵۹ء)

''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے۔ جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ناول کا آغاز ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم سے ہوتا ہے جس کے اشعار کچھ اس طرح سے ہیں:۔

مستقبل اور ماضی پر یکسان دھیان کرو
یہ لمحہ کرم بانہہ کرم کا نہیں جانو
کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر بھی
مرکوز ہو (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے) وہ محض ایک کرم ہے۔
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو۔ آگے چلو ۲۵

دراصل قرۃ العین حیدر نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت ایک تو اودھ کے معاشرے کا زوال یعنی وہاں کی تہذیب کا زوال اور دوسرا ملک تقسیم کا ماحول تھا یہی وجہ رہی کہ ان کی ابتدائی تینوں تخلیقات میں تقسیم کے المیہ کی عکاسی ہمیں ملتی ہے۔ ''آگ کے دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے حادثے کو قدیم تہذیب یعنی ڈھائی ہزار سال کی تہذیب کے تناظر میں پیش کر کے نہ صرف ملک اور قوم بلکہ انسانی تاریخ کا جز بنادیا۔ ناول میں قرۃ العین حیدر نے ''شعور کی رو'' کی تکنیک کا استعمال کیا جو اس سے پہلے ہمارے کسی بھی ادیب نے اس تکنیک کو مکمل طریقے سے نہیں برتا تھا۔ اس تکنیک میں پلاٹ اور واقعات پر زور دینے کے بجائے کرداروں کی ذہنی کیفیت پر زور دیا جاتا

ہے۔اس تکنیک کا نظریہ سب سے پہلے امریکہ کی ایک ماہر نفسیات ولیم جیمز نے 1890ء کے لگ بھگ دیا تھا۔ انہوں نے اس تکنیک کے اصول وضابطہ مقرر کئے اور اس تکنیک پر ایک مکمل کتاب (Principles of Psychology) لکھی۔انہوں نے اس کتاب میں واضح کیا کہ شعور کسی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ تو ندی کے دھارے کی طرح ہر دم رواں دواں ذہنی حالت ہے۔

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیب وتاریخ کو پیش کیا ہے۔ ابتدائی وہ دور ہے جب آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور ملک میں مختلف ذاتوں نے جنم لیا تھا۔ آریہ سے پہلے یہاں دراوڑ لوگ رہتے تھے جو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے ۔ جب آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں کے باشندوں اور آریہ خود پانچ حصوں میں تقسیم ہوئے اور ان طبقوں کو قرۃ العین حیدر نے جن کا تذکرہ کیا ہے یوں ہیں کشتری، برہمن، ویش، شودر اور جنڈال وغیرہ ۔ کشتری سب سے اعلیٰ طبقہ ہے جو حکومت کرتے ہیں اور جنگی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ برہمن جو مذہبی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں دوسرے درجے پر ہیں ویش تیسرے درجے پر ہیں اور تجارت کا کام کرتے ہیں۔ شودر ہندوستان کے اصل باشندے ہیں اور یہ غلاموں کا کام کرتے ہیں کیونکہ جب آریہ ہندوستان میں آئے تو ان کو شکست دے کر غلام بنادیا گیا ان کو چوتھا درجہ دیا گیا ۔ اسکے بعد چنڈال میں یہ آخری درجے ہے اور یہ بدترین زندگی گزارتے ہیں۔ ہندوستان شروع سے ہی گروہ میں تقسیم رہا۔ ہندوستان کا معاشرہ ذات پات کی تقسیم میں جکڑا ہوا معاشرہ ہے اور اس سے یہ کبھی بھی نجات نہیں پاسکا۔

قرۃ العین حیدر نے ناول ''آگ کا دریا'' کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اوران سب چار ادوار پر مفصل گفتگو کی ہے ۔ قرۃ العین حیدر نے ڈھائی ہزار سالہ پہلے سے لیکر تقسیم ملک اوراس کے کچھ سال بعد تک کو اپنے اس ناول میں موضوع بنایا ہے۔اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے موضوعاتی سطح سے ہٹ کر فارم اور ہیئت کے لحاظ سے بھی بعض نئے اور معنی خیز تجربے کئے ہیں اور بیانیہ تکنیک میں اس کہانی کو پیش کیا ہے ۔

ناول کی پہلی کہانی آریہ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے ۔ جب یہاں ہندوستان میں بدھ مت کا بول بالا تھا۔جس میں چندر گپت موریہ کی حکومت تھی۔اس درد کا مرکزی کردار گوتم نیلمبر ہے جو ایک طالب علم ہے ۔یہ نو جوان انسانی زندگی کی معنویت ، حیات وکائنات کا مفہوم اور عدم وجود کے اسرار جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ قدیم ہندوستان کی روح کا نمائندہ کردار ہے ۔ یہ جدید ذہن کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بدھ مذہب سے بھی بہت متاثر ہے۔ وہ ایک آشرم میں رہتا ہے یہاں اس کی ملاقات ہری شنکر سے ہوتی ہے ۔ان دونوں کے خیالات میں زمین وآسمان کا فرق ہے ۔گوتم یوں تو ایک سادھو کی زندگی گزارتا ہے مگراسی دوران اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور چمپادت نام کی ایک لڑکی سے عشق کرنے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد چمپا کی شادی ایک براہمن سے ہوجاتی ہے ۔لیکن گوتم چمپا کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا ۔مطلب یہ کہ گوتم نیلمبر اور چمپا اس دور کے نمائندہ کردار ہیں اوراس ابتدائی دور کی بھر پور نمائندگی کرتے ہیں۔

دوسرا دور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع ہوتا ہے ۔ اورمغلیہ عہد اس دور

کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ ابوالمنصور کمال الدین اس دور کا نمائندہ کردار ہے جو اس دور کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی آمد کثیر تعداد میں ہندوستان ہوتی ہے ۔ یہاں جب مسلمان آئے تو وہ یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ انہوں نے ہندوستان کو ہی اپنا گھر بنالیا۔ یہاں کی تہذیب میں وہ گھل مل گئے یہاں انہوں نے مضبوط حکومتیں قائم کیں امن پسند صوفیوں نے یہاں اسلام پھیلایا جہاں ذات مذہب کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ امن اور چاشنی کے ساتھ یہاں کی تہذیب پروان چڑھی۔ اس دور کی کہانی ابوالمنصور کمال الدین جو بغداد سے آیا اور یہاں کی تہذیب میں رہنے لگا اُس کردار کی کہانی کو اس دور میں بتایا گیا ہے۔ اس نے یہاں کے ناولوں کا بھی بغور مطالعہ کیا جس میں شنکر آچاریہ، ولبھ اور راما نند کے ناول شامل تھے ۔اس کے علاوہ اور بھی کئی مذہبی پیشواؤں کا اس نے مطالعہ کیا۔ یہاں پر اس کی ملاقات ایک برہمن لڑکی چمپا سے ہوتی ہے اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے اور چمپا بھی اس سے محبت کرنے لگتی ہے ۔ لیکن اسی دوران جنگ ہوتی ہے اور دونوں جدا ہوجاتے ہیں۔ مغلوں اور ہندوستانی تہذیب سے یہاں جو مشترکہ کلچر تہذیب پیدا ہوئی اس کی مثال ماضی ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہاں دوسرے دور کی کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے۔

ناول میں تیسرے دور کی کہانی انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ انگریز جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے یہاں آئے اور پھر آہستہ آہستہ یہاں کے حکمرانوں کو کمزور پاکر یہاں حکمران بن بیٹھے ۔ ۱۸۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں

ہندوستانیوں کو انہوں نے شکست دی اور عملی طور پر یہاں حکومت کرنے لگے ۔ اس دور کا نمائندہ کردار سرل ایشلے ہے۔ جو انگریزوں کی نمائندگی کرتا ہے اور نمائندہ انگریز کردار ہے سرل ایشلے برطانیہ کا رہنے والا ہے جو وہاں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ہندوستان آتا ہے اور کلکتہ میں رہتے رہتے وہاں کی سوسائٹی کے ساتھ گھل مل جاتا ہے اور پھر یہاں ہی کا حصہ بن جاتا ہے یہاں ناول کا تیسرا دور ختم ہوتا ہے۔

ناول کا چوتھا حصہ ان سب دور کا نچوڑ ہے یہاں یہ سب کردار یو۔پی کے اونچے طبقے کے تعلیم یافتہ نو جوان کی شکل میں ابھرتے ہیں ۔ یہ سب سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں ۔ اس دور کے کرداروں میں گوتم ، کمال ہری شنکر ، چمپا احمد، طلعت ، نرملا اور ساجدہ وغیرہ ہیں۔ چمپا احمد کے علاوہ سب قوم پرست ہیں جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے بے پناہ علمبردار ہیں۔ یوں تو یہ سب بیسویں صدی کے نمائندہ کردار ہیں مگر یہ لوگ اپنے اندر پرانی ڈھائی ہزار سالہ تہذیب کو سمٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر گوتم نیلمبر اور ابوالمنصور کمال الدین سب کی روحیں موجود ہیں۔ اسی لئے یہ سب لوگ محبت واخوت قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح اس موجودہ دور کے ساتھ یہ ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے ۔ پلاٹ کے لحاظ سے قرۃ العین حیدر کا یہ ناول بہت حد تک کامیاب مانا جاتا ہے۔ اس ناول ''آگ کا دریا'' کا آج تک کوئی ثانوی ناول نہیں لکھا گیا۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے اس ناول ''آگ کا دریا'' میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ جب کہیں بھی اور کسی بھی تہذیب میں دو ڈھائی ہزار

سال کی تہذیب کی بات ہو تاریخ کی بات ہوئی ہو اور وہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بات نہ ہوئی ہو ایسا ہرگز ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ قرۃ العین حیدر کا بچپن جن لوگوں اور جن جگہوں پر گذرا وہاں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی کسی مذہب اور کسی ملک کے خلاف پرا پگنڈہ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ قومیت کے مسئلے میں کبھی بھی متنازعہ نہیں رہی۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''آگ کا دریا'' میں جس تہذیب کی بات کی ہے یا جس تہذیب کو موضوع بنا کر ناول لکھا وہ بھائی چارے کی تہذیب تھی خواہ وہ بدھ مت کا عہد ہو یا پھر جدید دور دونوں طریقے سے ہمیں یہاں مشترکہ تہذیب ملے گی۔ جب ناول میں ویدک عہد کی بات ہوئی تو اس میں بھی قرۃ العین حیدر نے بھائی چارگی اور مشترکہ تہذیب کی مثالیں کچھ اس طرح سے پیش کیں ہیں:۔

> ''شہراوستی کا شہر بیت گنجان اور بارونق تھا، دور کے دیشوں سے آئے لوگ یہاں رہتے تھے، الگ الگ محلوں میں کاریگر، سنار ،بزاز اوردوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں۔ ان کی اپنی اپنی منڈیاں تھیں اپنے قوانین چوروں تک کی منڈلی مع ایک باضابطہ شاستر کے موجود تھی۔ بارہ مہینے چہل پہل رہتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگارخانوں میں مصروف رہتی۔ ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہوجاتا اور دن بھر جاری رہتا

..........تہواروں کے موقعے پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے
گاتے پھرتے۔ ڈوم نقلیں کرتے۔ دیش ناریاں چھن چھن کرتی
اپنی گلیوں میں ٹہلتیں۔ امیر زادیاں سولہ سگار کیے تھالیوں میں گھی
کے چراغ جلانے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں۔ طوراورلوبان کی
خوشبو سے فضا بوجھل ہوجاتی۔''۲۶؎

ایک جگہ آگے یوں رقمطراز ہیں:۔

''شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری سورما سندھ اور
ایران اور عرب کے اصل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر
آتے۔ گاؤں کی سمت جانے والے سایہ دار کچے راستوں پر
کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بہلیاں چرخ چوں کرتی نرم روی سے
چلتی رہتی۔''۲۷؎

قرۃ العین حیدر نے ان اقتباس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بدھ مت زمانے میں بھی کس طرح آپسی بھائی چارہ وہاں اس شہر کے کاریگروں، سناروں اور دوسرے پیشہ وروں لوگوں میں تھا اس دور میں بھی جماعتیں اور قوانین بنے ہوئے تھے جو نظم نسق قائم رکھنے میں مدد دیتے اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے قائم رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوئے۔ شہر اوستی میں بارہ مہینوں رونق رہتی اور ہمیشہ حکمران طبقے کا یہ زور ہوتا کہ کوئی نہ کوئی تہوار ضرور منایا جائے جس سے لوگوں میں ایک دوسرے کے تعین محبت واخوت پیدا ہو۔ قرۃ العین حیدر نے خوشبوؤں کے لئے طور اور لوبان جیسی خوشبو کا یہاں ذکر کر کے یہ

باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ لوگوں میں خوشحالی اور امن وشانتی کا ماحول تھا کہیں بھی کوئی تشدد وغیرہ نہیں تھا۔ یہاں کے لوگوں میں دوسرے ملکوں کے ساتھ روابط زمانہ قدیم سے ہی موجود رہے ہیں۔ ایران اورعرب سے خاص قسم کے گھوڑے سواری کے لئے منگوائے جاتے تھے وہ لوگ عربی اور ایرانی گھوڑے لے کر تاجر بیوپار کی غرض سے یہاں ہندوستان میں آئے یہاں کی بھائی چارگی سے کافی حد تک متاثر تھے وہ لوگ اس لئے اتنے دور سے وہ یہاں آتے لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کی کوئی واردات کبھی ان کے ساتھ پیش نہیں آتی تھی۔ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کا احترام کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا یہاں کے لوگوں کا شیوہ رہا ہے ۔ یہاں آپسی بھائی چاری کی یہ مثال کہ اگر کوئی عمر یا عہدے میں بڑا کسی مجلس یا کسی کے گھر آیا تو تعظیماً کھڑا ہوکر دوسرے کو بیٹھنے کے لئے جگہ دی جاتی ہے ۔خصوصاً صوفی سنت لوگوں کو بہت احترام کے ساتھ بٹھایا جاتا ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں یوں پیش کیا ہے:

''مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے' ہری شنکر نے مختصراً جواب دیا۔ آؤ ادھر چل کر دیکھیں کیا ہورہا ہے۔''

گوتم چپ ہوگیا۔ وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے۔

''تم بھیشم کا قصہ سنو گے؟ مجمعے کے قریب پہنچ کر گوتم نے ذرا غیر یقین انداز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''کیا حرج ہے''اسے جواب ملا

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعظیماً

ان کے لئے جگہ خالی کر دی۔ بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنایا گیا۔ گوتم
نے اسے پہچان لیا۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر
اسے پرنام کیا اور خود بھی قصہ سننے میں مصروف ہو گیا۔'' ۲۸

صدیوں سے ہمارے ملک ہندوستان میں روایت رہی ہے کہ بڑوں کو عزت دینا اور چھوٹوں کو شفقت کے ساتھ پیش آنا یہ سب یہاں کی مثال رہی ہے ان سب چیزوں کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں خوب برتا ہے اور یہ سب بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہاں بھائی چارگی عرصہ قدیم سے قائم رہی ہے۔ ہر انسان فطری طور پر آزاد ہے اور یہاں ماضی میں بھی دوسرے کی آزادی چاہئے وہ بڑا ہو یا چھوٹا آسے اپنی بات کہنے اور سننے کا حق رہا ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:۔

'' آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ
کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ
سے سوال کیا۔ ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آنند
اسرار جو تم پر منکشف ہوئے وہ سوائے تمہارے اور کون جانے گا ہم
سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے۔'' ۲۹

قرۃ العین حیدر نے مشترکہ تہذیب میں پرورش پائی جب وہ جوان ہوئی تو ملک انگریزوں سے آزاد ہوا۔ ہمیں آزادی تو ملی مگر ملک کے دو حصے ہوئے، ملک بھی تقسیم ہوا۔ قتل و غارت کا ماحول پیدا ہوا۔ انسان انسان کا دشمن بنا۔ لاکھوں انسان زندہ جل گئے۔ اس آزادی سے پہلے یہاں کے ان ہی لاکھوں انسانوں نے مل کر آزادی حاصل کی تھی۔

اور آزادی کے بعد ان ہی لوگوں کو اپنی جان گنوانی پڑی۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے 1947ء کی آزادی کو اشارتاً پیش کرنے کی فلسفیانہ انداز میں کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بڑی ذہین قلم کار تھیں انہوں نے آزادی اور تقسیم کے واقعات سے متاثر ہوکر ایک نہیں تین تین ناول تخلیق کئے اور ان سب ناولوں میں کہیں نہ کہیں مٹتی ہوئی تہذیب، مٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ملک تقسیم اور فسادات کو موضوع بنایا ہے۔ اور یہی وجہ رہی کہ وہ آزادی کو کبھی گوتم کی زبانی، کبھی ابومنصور کمال الدین کی زبانی اور پھر کبھی سرل ایشے کی زبان اس پر تبصرہ کرتی ہوئی نظر آتیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے سے بہت محبت واخوت تھی اور اس تہذیب کو وہ اپنے سامنے مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور یہی وجہ ہے دہلی کی وہ عملی سطح پر تو کچھ کر نہیں سکتی تھی مگر اپنی قلم کے ذریعے انہوں نے اس مٹتی ہوئی تہذیب کی شدید الفاظ میں مذمت کیں۔ اس تہذیب کو ایک تو ہندوستانیوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بگاڑا اور دوسرا انگریزوں نے یہاں جو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide and role) کی پالیسی اپنائی اس سے یہاں کی تہذیب یہاں کے بھائی چارے اور قومی یکجہتی کو بہت نقصان پہنچا۔ انگریزوں نے یہاں جبر کی حکومت کیں یہاں طرح طرح سے ظلم وستم ڈھائے اس کو بھی قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

> ''اس نے دور سے اپنی نقرائی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی، ''ابو المونشور اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ!''

اس نے کہا......

بھوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کس قدر سخت جان لوگ ہیں۔ اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑھا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں۔ وبائیں پھیلتی ہیں مگری ہ لوگ اسی بے حیائی سے جیتے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔''۳۰؎

دوسری جگہ آگے قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

''آٹھ جون ۱۷۹۸ء۔ سرل ایک بیگ چونک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہوگئے تھے۔ ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کررہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم توڑ چکی تھی۔ اس کی جگہ کمپنی نے انگریز پلانٹر دہلی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹر سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان پلانٹرز کے بھائی بند تھے۔''۳۱؎

قرۃ العین حیدر نے مثالوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز ہمارے ملک ہندوستان میں حکومت کرنے نہیں بلکہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور جب انہوں نے یہاں پایا کہ حکمران طبقہ کمزور ہے آپسی لڑائیاں ہماری ختم نہیں ہوتی تو انہوں نے آہستہ آہستہ یہاں حکومت میں دلچسپیاں لینی شروع کیں اور بھر حکمران بن بیٹھے اور پھر آہستہ آہستہ یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے میں خلل ڈالا۔ یہاں مظالم ڈھائے ۔جانوروں کا سا سلوک انسانوں کے ساتھ روا رکھا۔اقتصادی طور پر ملک کو اور قوم کو کمزور کیا۔ یہاں وہ تو دن رات ترقی کرتے تھے مگر یہاں کے لوگوں کا خون جوستے تھے ۔انہوں نے کبھی یہاں یہ نہیں سوچا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان بلکہ یکساں ظلم وجبر ڈھاتے رہے ۔کاشتکار دن بدن غریب ہوتے جارے تھے ظاہر ہے کہ جب یہ سب کچھ ہمارے سماج میں ہوتا ہے تو ایک ادیب اوراس کی تحریریں ان سب باتوں کو تحریر کیے بنا نہیں رہ سکتی اور یہی معاملہ قرۃ العین حیدر کا بھی ہے کہ انہوں نے آزادی سے پہلے جو انگریزوں کے ظلم عوام پر ڈھائے گئے وہ سب پر یکساں تھے چاہے وہ ہندو ہو یا پھر مسلم انہوں نے کسی قوم کو نہیں بخشا اور یہی آپسی چارے کی یہ مثال بھی ہے کہ یہاں کہ ہندو پر اگر ظلم ہوئے تو مسلمان بھائی کبھی خوش نہیں ہوئے اور اگر مسلمان بھائی پر کوئی ظلم ہوا تو ہندو بھائی کبھی خوش نہیں ہوا۔

مذہب چاہے یہاں کے لوگوں کے الگ الگ ہوں مگر یہاں کی تہذیب ایک ہے یہاں کے رسم ورواج ایک ہیں۔ یہاں مسجد اورمندر میں فرق نہیں سمجھا جاتا یہاں کے

مقدس مقامات کی لوگ برابر عزت کرتے ہیں جن کی مثال قرۃ العین حیدر کی اس طرح سے پیش کرتی ہیں:۔

''کچھ دیر بعد ان جوگیوں میں سے ایک کمال کے قریب سے گذرا ۔ وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی ۔''

''بھائی تم مسلمان ہو۔کمال نے ہمت کرکے اس سے پوچھا۔

''انسان ہوں، اس نے مختصر جواب دیا۔''

'' میں ...... میں بھی انسان ہوں۔'' کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا''

''کیا چاہتے ہو۔''

''یہ پتا نہیں۔''

'اگر اپنے دل کا عقیدہ خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام ۔ ادھر جاکر بیٹھو۔'' اس نے امیر زادوں کی طرف اشارہ کیا ۔ ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا تھا۔

''تم کہاں جاتے ہو۔''

''کاشی''

''وہاں کیا ہے؟''

''وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے ۔ وہاں مسرت ملتی ہے

۔ وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ ۔ وہ جو گرو ہے میرا ۔ لیکن
افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوادی اوراس کو نہ جانا۔'' وہ ٹھٹھک گیا ''تم
جانپور کے کمال الدین ہونا۔'' ۳۲؎

کاشی ہندوؤں کا مقدس مقام ہے وہاں ذات پات کی نہیں بلکہ یہاں کی قوم آپسی بھائی چارے کی وجہ سے جاتے ہیں وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو وہاں ضرور جاتا ہے تا کہ روحانی تسکین حاصل ہو اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اجمیر شریف اورحضرت نظام الدین کی زیارت پر بھی تمام مذاہب کے لوگ ہمیں یکساں نظر آئیں گے، خواہ وہ ہندو ہو مسلم یا سکھ عیسائی بغیر مذہب وملت نظر آئیں گے۔

''بغداد اور جونپور کا ابو المنصور کمال الدین ،مؤرخ ،محقق ،
سیاستدان، سپاہی، جسے تصوف اورمعرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ
تھا، بالآخر کاشی کے نیچے گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔'' ۳۳؎

یہاں قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''آگ کا دریا'' میں یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح جن لوگوں کو مذہب سے کوئی سروکار ، واسطہ نہیں ہوتا وہ بھی یہاں کی مٹی میں آکر تصوف اورمعرفت کی باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ یہاں کی یعنی ہندوستان کی یہ خاصیت رہی ہے کہ یہاں جوصوفی سنت ہوئے ہیں انہوں نے عوام کے ساتھ یکساں سلوک کیا اورایک جیسا فیض سبھی کو پہنچایا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم یا پھر سکھ عیسائی اور یہی وجہ ہے کہ ان صوفی سنتوں کی درگاہوں اور درباروں پر تمام ہندوستانی برابر شریک ہوتے ہیں یہاں کے گیت سانچے میں اوران میں قومی یکجہتی آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں ضرور ملتے ہیں جس

کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول ''آگ کا دریا'' میں کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:۔

''اگر محمد اوتار جنم نہ لیتے ...... کیرتن منڈلی نے گایا............تو
اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمونمو ہے عبداللہ اور آمنہ
جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگت کی ماتا ہیں۔
جے ہو اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔
جے ہو پورب سے نکلے سوریہ کی۔
اب میں وندرابن کے سامنے جھکتا ہوں۔
بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام۔
جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی
جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سنکھا ندی کی
نوپاڑا کی مسجد کو میرا پرنام
کیونکہ وہ بڑے پیر ایک بار ان خطوں سے گذرا تھا
اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام تھا۔
جے ہو۔ جے ہو۔ جے ہو۔''[۳۴]

اس نظم میں اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے مذہب

کا نچوڑ ملتا ہے۔ تمام مذہبی پیشوا کو کس طرح سے ان کی تعریف اور پوجا کی ہے اور یہی خاصیت یہاں کے ہندو اور مسلمانوں کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہیں جس سے ملک میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ بنتا ہے ۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے مندرجہ بالا نظم میں پیش کر کے پورے ہندوستانی کلچر کی نمائندگی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں قومی یکجہتی کی اور ایک مثال آگے چل کر جب قرۃ العین حیدر رشتوں کی بات کرتیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھائی چارگی اس حد تک ہے کہ یہاں رشتے خون کے نہیں بلکہ میل ملاپ سے بنے ہوئے ہیں کوئی کسی کی خالہ کوئی کسی کا بھائی کوئی کسی کا چچا، ماموں وغیرہ وہ بھی خون کے نہیں بلکہ راکھی کے ہیں۔ احساس کے رشتے جس کی ایک مثال کچھ اس طرح سے ہے:۔

''یہ رگھو ماما کا اسکول تھا۔ بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور گنی چنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھی۔ بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔ برابر کے مکان میں رگھو ماما معہ خاندان کے رہتے تھے یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے ۔ پرانے مدرسہ فکر کے کائستھ ۔ لڑکیاں شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کی پتریاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور یہاں زیور علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اسٹاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے کے ساتھ ناطہ تھا۔ یہ رشتہ خون کا نہیں بلکہ وضعیداریوں کی وجہ سے قائم تھے ۔ موسی، ماما، باجی آپا، دیدی، بھیا۔ اسی طرح حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا'' ۳۵

یہاں ہمارے ملک میں مشترکہ تہوار، ہولی، عید، دیوالی، راکھی ان سب تہواروں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی جو مثالیں ہمیں قرۃ العین حیدر نے پیش کیں ہیں وہ کسی دوسرے ادیب کے ہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''آگ کا دریا'' میں آگے دوسری جگہ قرۃ العین یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میرے دوست لیلہ بھارگوا کے۔''۳۶

یہاں کے لوگ امن پسند ہیں۔ یہاں باہر کے حملہ آوروں نے آکر ہمیشہ سے ہندوستان کو لوٹا اور حکومت کی مگر یہاں کے ہندوستانیوں نے کبھی کسی ملک یا علاقے میں جا کر لڑائی، لوٹ، کھسوٹ کبھی نہیں کی۔ اس بات کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے یہاں کے لوگ ہمیشہ امن پسند۔ بھائی چارگی کے لئے مشہور ہیں:

> ''امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے۔ میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈ رو ولسن لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں ماتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیئے اور قائد اعظم جناح کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاک خیز ہے ایک دفعہ ہم بچھڑے تو کبھی نہیں مل سکیں گئے مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے۔ یہ کانگریس کا فراڈ ہے۔ وہ مسلمانوں

کو غلام بنانا چاہتی ہے۔''۳۷

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے جو مسئلہ پیش کیا ہے وہ تقسیم ملک کے آس پاس کا تھا۔ مگر اس وقت بھی لوگوں کی سوچ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی تھی حالانکہ کچھ ایک یا چند عناصر اس ماحول کو بگاڑنا چاہتے تھے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلم اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے مگر اس دوران گاندھی جیسے اور دوسرے کئی ایسے لوگ موجود تھے جو بھائی چارہ اور ملک تقسیم کے خلاف تھے اور کچھ بٹوارے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لئے رہتے تھے جس کی مثال قرۃ العین حیدر یوں دیتی ہیں:

''مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں''

''ویشنو بھگتی کا مذہب ہے، اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔''

''پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی۔''

''ہاں لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔''

''اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہوسکتا۔''

''تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو............ایسا نہ کرو۔''

''پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔ کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی

تھی۔اس میں جو لوگ شامل تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر
اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے۔ وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے
تھے۔ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں بٹی تھی: کفر اور اسلام ۔
انہوں نے کفر کی خلاف جہاد کیا ۔آخر کون یہ بتائے گا کہ دوسرا
انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے اپنے نقطۂ نظر سے حق
بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔''۳۸

نوٹنکی کا ناچ ہندوستان میں بہت مشہور ہے یہاں یہ تہوار ہندو سے لیکر مسلمان اور سکھ بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔اس سے ہمارے سماج میں ہماری تہذیب میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اس کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول ''آگ کا دریا'' میں کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''اور گھاگرا کے کنارے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھ کر چاندنی رات میں الہا اودل کی باتیں اڑاتے تھے۔علیؑ علیؑ کر کے سید دوڑیں۔ الہا کھینچ لیں تلوار۔اور قدیر کا بھانجا نوٹنکی میں چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا سکر ہے لیلیٰ تیرے دربار میں آیا
کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا

''چمپا باجی...... وہ نوٹنکی تم کو یاد ہے ۔ ہم تمہیں کرسمس کے
زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کمبلوں میں لپٹ
کر ہم نے لیلیٰ مجنون ملاحظہ کیا تھا اور میرے گاؤں کے اداکار ہم

کوخوش کرنے کے لئے اپنا سارا آرٹ صرف کیے ڈال رہے تھے

۔''۳۹

یہاں ہمارے ملک میں کس طرح دوسروں کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھا جاتا ہے یہاں ہندومسلم کی کوئی دیکھا نہیں ہے اورسیدھے سادھے گاؤں والے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلم لیلیٰ مجنوں کے قصے کو آج بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے اورسناتے ہیں یہاں کی زبان ایک ہے جو ہندو اور مسلم آپس میں بیٹھ کر اپنے اس مشترکہ کلچر کی باتیں کرتے ہیں ۔اپنے وطن اس قوم کو کتنا عزیز ہے اس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''لو میاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم اس پنجاب گروی سے کہاں تک بچے رہتے۔''ہمراز بھائی اس صدمے میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدانخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہوسکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پردیس والے ہندومسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے اس کی عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اورشعر پڑھتے ایک روز کمال اس محفل میں گیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی۔''۴۰

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں بتایا ہے کہ جس قدر ہندو اس ملک ہندوستان سے محبت کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح مسلم کو بھی یہ وطن بہت عزیز ہے ۔مسلمانوں کے نام پر ایک نہیں دو ملک پاکستان اور بنگلہ دیش بنے ہیں مگر جو عام آدمی کو اپنی اس پرانے

ہندوستان سے انس تھی وہ ان کو نہ ہی پاکستان میں اور نہ ہی بنگلہ دیش میں نظر آئی بلکہ انہوں نے لاکھوں مسلمانوں نے تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں رہنا پسند کیا اور اس کی خاطر ان کو کتنا جانی و مالی نقصان ہوا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے اس بات کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول'' آگ کا دریا'' میں یوں پیش کیا ہے:

''اب کیا ادارہ ہے؟'' کمال نے اپنے بابا سے پوچھا۔''کب ہجرت کیجئے گا پاکستان؟''

''یہیں رہوں گا۔'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔'' کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔''

کمال ہکا بکا رہ گیا 'مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔''

ہاں ہاں تو پھر؟ پاکستان بن گیا ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہوا کہ ہم بھی بھاگ جائیں جہاں سے ۔''[۴۱]

آگے دوسری جگہ قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:۔

'' آپ یاتری ہیں۔ بڑی دور سے آتے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔ نیک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نوا کھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو رنج کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔''[۴۲]

کارِ جہاں دراز ہے (جلد اول، دوم، سوم)

''کارِجہاں دراز ہے'' قرۃ العین حیدر کا سب سے ضخیم ناول ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ کارِ جہاں دراز ہے ، حصہ اول اور دوم مکتبہ اردو ادب لاہور سے شائع ہوئے، پہلی جلد ۱۹۷۷ء اور دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی جبکہ جلد سوم ایجو کیشنل ہاؤس دہلی سے شائع کروائی۔ اس ناول کو قرۃ العین حیدر کا فیملی ساگا کہاجاتا ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے اپنی ذات کو کم اور اپنے خاندانی نسب شجرہ کو زیادہ موضوع بنایا ہے۔ پہلی جلد میں بارہویں صدی سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہے جس میں مصنفہ نے اپنے آبا واجداد کا تذکرہ کیاہے اوراس میں کئی اہم سیاسی وادبی شخصیات بھی شامل ہیں۔ دوسری جلد میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک کا عہد ہے اوراس جلد میں بھی پاکستانی رشتہ داروں اور وہاں کے دوستوں کی تاریخ رقم کی ہے۔

مصنفہ کے اپنے بیان کے مطابق ان کے تین حصّوں کی کتاب ٹرلوجی ایک سوانحی عمرانی داستان ہے جس کے گونا گوں ایڈونچرز ،کو بیان کیا گیا ہے ۔خودقرۃ العین حیدر اس ناول کوسوانحی عمرانی داستان کہتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کے اس بیان کے باوجدود یہ ناول فیملی ساگا نہیں۔ اس میں برعظیم پاک وہند کی بنتی بگڑتی صورتحال وقت کے آئینے میں شفاف طور پر دکھائی گئی ہے۔ اس میں ہندو پاک کی باقاعدہ تاریخ رقم کی گئی ہے ۔زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان پر باہر سے آنے والے حملہ آوروں کا دبدبہ رہا ہے اور یہاں آکر مختلف قومیں آباد ہوتی ہیں خود مصنفہ کا تعلق بھی باہر سے آئی ہوئی اقوام میں سے رہا ہے۔ یہی وجہ رہی کہ کارِ جہاں دراز کے پہلے حصے میں قرۃ العین حیدر نے اپنے خاندان کا خوب

تذکرہ کیا اور اپنا شجرہ نسب عرب سے جوڑا ہے ۔ قرۃ العین حیدر کے خاندان کا رویہ دوسرے خاندانوں سے جدا رہا ہے جو فیوڈل طبقے کے مزاج کی پہچان رہی ہے ۔ مگر طبقات ہرسطح پر وضع ہوتے ہیں جو انسان کی فطرت میں شامل ہے یہی وجہ رہی کہ قرۃ العین حیدر خود کو اور اپنے خاندان کو نمایاں حیثیت سے دیکھتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک ہندوستان کی نمایاں خامی رہی ہے کہ یہاں ذات پات ، طبقات ان کی روح میں بسی ہوئی ہے ۔ اور یہ قرۃ العین حیدر کا شعور ہی ہے جو معاشرے کے ایک بڑے المیے کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اوراس معاشرے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی عناصر ڈھونڈتی ہیں اور پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' کا عنوان اقبال کے اس شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِجہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

''کار جہاں دراز ہے'' کا ابتدائی تعارف حمد ونعت کے ان اشعار سے کیا ہے:

خداوند اکبر سمیعاً بصیراً   بقدرت علی کلی شئی قدیرا
دہی مومنا را اکرام دافر   بہ جنت نعیماً وملکا کبیرا
بمثل کلامت کہ گفتن تواند   ولوکان بعضاً بعض ظیراً
کسے را کہنامش دہی برینیش   بلطف تحاسب حساباً یسرا
کمال حسینی یساجرم دارو   تونی عفون کن یالطیفاً خبیرا۹ے

اس کے بعد قرۃ العین حیدر فلسفیانہ انداز میں کچھ اس طرح سے اس ناول کی شروعات کرتی ہیں:۔

''اللہ کے نیک بندوں نے حمد و مناجات، عبادت و خدمت خلق میں زندگیوں تیر کردیں۔نہ دنیائے دوں بدلی نہ سلسلہ علت ومعلول۔ اورفرشتے ہیں کہ لکھتے چلے جارہے ہیں۔ ناحق پکڑواتے ہیں۔ پلٹ کر بندخاکی سے نہیں پوچھتے کہ میاں! تم اشعریہ تھے یا معتزلہ یا لاروی۔ جبریہ ہو یا قدریہ۔ مومن ہو یا مشلک، کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا اور ایک موونگ فنگر ہے جو لکھ کر آگے سرک جاتی ہے۔''۸۰ے

اس کے بعد قرۃ العین حیدر اپنے آبا واجداد کی شجرہ نسب کی طرف جاتی ہیں اور اپنے خاندان کے لوگوں کے دوسروں کے ساتھ تعلقات کو بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے یہاں ہندوستان میں وارد ہونے کو قرۃ العین حیدر کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

''جاننا چاہئے کہ شمالی ہند پر تورانی فوجی تسلط کے دوراولین میں ترکستان اورایران کے مشائخ اور ملٹری ایڈونچررز انبوہ در انبوہ یہاں پہنچ رہے تھے اور اس ملک کے فیوڈل راجپوت سوسائٹی تہ وبالا ہورہی تھی ۔ان غیر محفوظ ومتزلزل ایام میں مسلمان اور ہندوعوام کے لئے ان درویشوں اورترک اور راجپوت فوجی سرداروں کا کلچر ہیرو اور فوک ہیرو بننا ناگزیر تھا۔ اس Traumatic عہد کی یاد

دیرپا ہے ۔ واضح ہو کہ اتر پردیش کے اکثر بوڑھے ہندو کسان اپنے
پڑوسی مسلمانوں کو عادتاً آج تک ''ترک'' کہتے ہیں۔''[۸۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی دور میں جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے تھے مگر ان کے ساتھ جوصوفیاء اکرام آئے انہوں نے عوام وخواص کو اپنے علم وہنر سے یکساں فائدہ پہنچانے کی کوشش کی اور یہی وجہ رہی کہ وہ اسلام کی بھی تبلیغ کرتے تھے اور بہت حد تک وہ کامیاب ہوئے ۔ یہاں بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے اور یہاں ایک مشترکہ کلچر کی بنیاد پڑی اور آگے چل کر یہی لوگ قومی یکجہتی اور آپسی چارے کے عناصر بنے۔ عہد مغلیہ میں بھی قومی یکجہتی کے عناصر کو قرۃ العین حیدر نے جہاں اپنی تمام تخلیقات میں برتا ہے وہی انہوں نے اپنے اس ناول'' کارجہاں دراز ہے'' میں بھی کچھ اس طرح کی مثالیں پیش کیں ہیں:۔

''ہندو آبادی علیحدہ نہیں تھی۔ مسلمان محلوں میں ملحق محلّہ بھوجی کھاواں غالبًا ویجی ٹیرین جینوں کی آبادی تھی۔ پھر محلّہ کایستھاں، محلّہ بقالاں، محلّہ چودھریاں۔ ہر مسلمان محلے کی اپنی مسجد تھی۔ ہندو محلوں میں مہادیو جی اور ہنومان جی کے مندر تھے ۔ عہدمغلیہ کی ہندو مسلم مفاہمت کی ایک روشن مثال۔''[۸۲]

ہندو مسلم اتحاد کی ایک مثال ہمارے ملک میں یہ رہی ہے کہ یہاں ہندو مسلم آبادی الگ الگ نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ محلے الگ ہیں مگر آبادی ملی جلی ہے ۔ ہر محلے اور گاؤں میں اپنے اپنے مندر اور مسجدیں ہیں۔ اور کہیں کہیں ہمیں ہندو محلے میں مسجد

اورمسلمان محلے میں مندر ملیں گے یہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں صرف ہندوستان میں ملیں گے ۔ اور جن کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں برتا ہے ۔قرۃ العین حیدر نے حالانکہ یہ اپنے سوانح ناول لکھے مگر وہ خود مشترکہ تہذیب کی دلدادہ تھی لہٰذا ان کی پرورش سے لے کران کی جوانی اور پھر بوڑھاپے تک وہ اس تہذیب کی آبیاری کرتی رہی جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر تھے۔ مگر جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے یہاں کے مشترکہ تہذیب کو کافی حد تک نقصان پہنچایا ۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے دور عہد میں کوٹھیوں کی جگہ محل ہوتے تھے ۔ اور جب انگریزی یہاں آئے تو انہوں نے ان محلوں کو گرانے کا م شروع کیا اور کوٹھیاں تعمیر کروانی شروع کیں ۔جن کو قرۃ العین حیدر نے یوں اپنا ناول میں پیش کیا ہے:۔

> ''اس کے صاحب کمال ہونے میں ہمیں اس وقت شک نہ رہا جب اس نے بجنور ایسے دقیانوسی شہر کا نقشہ بدل دیا ۔کوٹھیاں 'کمپنی باغ 'ہسپتال، بنگلے کہتے ہیں کہ گورا تاجر اول اول بنگال میں وارد ہوا اور بنگالی وضع کے پھونس کی چھتوں والے گھر اپنی رہائش کے لئے تعمیر کروائے جو بنگلہ کہلانے لگے ۔اب بجنور سول لائنز میں کلکٹر ،جج، انجینئر ، پادری، سول سرجن، کپتان پولیس سب اپنے اپنے شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں۔''۸۳؎

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ انگریزوں سے پہلے یہاں ظلم وجبر نہیں ہور ہا تھا بلکہ بہت زیادہ

ہورہا تھا مختلف اقوام کی جنگیں ہوئیں ہزاروں قتل وغارت ہوئے مگر ان کے بارے میں مصنفہ یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''فرنگی اب ایک عرصہ سے دوہیلکھنڈ میں براج رہا ہے۔ہمیں تاتاریوں اور مغلول اور افاغنہ اورترکوں سے سابقہ پڑا۔ جنگ وجدال رہا۔مگراپنے ہم مذہب تھے ۔راجپوتوں سے واسطہ ہے کہ اپنے ہم وطن بھائی اور ہمسائے ہیں۔ امرائے ہنود فخریہ اپنے ناموں کے ساتھ شاہجہانی ، عالمگیری ،محمد شاہی لکھتے تھے۔ یہ گورا البتہ سمجھ میں نہ آیا ۔کیا جانئے اس کے پاس کیا اسم اعظم ہے ۔ چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے ۔ سنتے ہیں کہ خلیفہ الاسلام سلطان روم اس کے ریشہ دانتوں سے عاجز ہیں۔شاہان قاچارکواس نے نالاں کررکھا ہے ۔زادروس اس کا نام سن کرتھرتھر کانپتا ہے۔''۸۴؎

مصنفہ نے بتایا ہے کہ مغلوں، ترکوں، افغانوں کے ساتھ بھی ہماری جنگیں رہیں ہیں مگر وہ اپنے تھے یہاں کی مٹی میں ان کا خون بھی شامل تھا۔ راجپوتوں کے ساتھ بھی معرکے ہوئے مگر وہ بھی ہمارے اپنے تھےمگر جب انگریز ہندوستان میں براجمان ہوئے تو سب کے سب لوگ عوام بغیر مذہب وملت آپسی بھائی چارگی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے لگے ان کو یہاں ہندوستان سے نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگے ۔جب

انگریز ہندوستان میں بر جمان ہوئے تو ان کے ظلم وستم کو لوگ قیامت کی گھڑی سے کم تعبیر نہیں کرتے تھے جس کو قرۃ العین حیدر کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہیں:۔

''قیامت کی گھڑی آن پہنچی ۔ قیامت سوانیزے پر آیا چاہتا ہے ۔ اب کہیں امن نہیں۔ فرنگی سپاہی بندوق کے توڑے چڑھائے چوطرفہ دندنا رہے ہیں۔ بے گناہ رعایا پر ہر طرح آفت ہے ۔صاحبان اور اوالعزم مثل بادصرصر کے کشور ہند پر چھا گئے ۔ امرائے ہند یا لہو لعب میں مبتلا ایک دوسرے کے درپے آزاد ہیں۔۸۵؎

ہمارے قوم کو ملک ہندستان بہت عزیز رہا ہے اور ہے بھی اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ یہاں سے جو لوگ بیرونِ مما لک گئے چاہے وہ تھوڑے دنوں کے لئے گئے یا پھر ہجرت کر کے اور کچھ سیر وتفریح کے لئے مگر وطن ہندوستان کی یاد کبھی ان کے دل سے نہیں گئی۔ اس کی ایک جیتی جاگتی مثال تقسیم کے وقت کی ہے جب پاکستان بنا اور یہاں کے مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں کے ہندو یہاں ہندوستان میں آ کر بسے مگر جب تک وہ لوگ زندہ رہے ،اپنی جگہ جنم بھومی ان کو بہت عزیز رہی اور اس آس میں وہ جیتے رہے کہ ہوسکتا ہے ہم دوبارہ اپنے اپنے ملک میں واپس جائیں مگر ایسا نہیں ہوا ۔اور اگر کوئی اپنی اس دھرتی کا ملا تو اس سے اپنی جنم بھومی کے بارے میں تفصیل سے پوچھنا اس سے گھنٹوں تفصیل جاننا ۔ وہاں کے کھیتوں وہاں کے درختوں وہاں کے پڑوسیوں کے بارے میں جاننا اپنا فرض سمجھتے اسی بات کو مصنفہ نے یوں پیش کرنے کی

کوشش کی ہے:۔

''ایک وطن سے دور دراز مقام میں یعنی قسطنطنیہ میں جہاں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وطن یاد نہیں آتا مگر جہاں میں رات دن وطن کی یاد میں اشکباری نہیں کرتا۔ اور میں کیا کوئی بھی نہیں کرے گا۔ کل مارچ کا اولڈ بوائے ملا۔ سیر وسیاحت چھوڑ چھاڑ کے اول اسے از ابتدا تا انتہا ختم کیا۔''۸۶؎

قرۃ العین حیدر نے یہاں کی تہذیب کو بھرپور اپنے ناولوں میں استعمال کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہاں کی تہذیب میں مہمان نوازی اور آپسی بھائی چارہ موجود تھا۔ آزادی سے پہلے یہاں ریلوے اسٹیشنوں پر کھانے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ بلکہ لوگ یا تو بھوکے یا پھر اپنے ساتھ گھر سے کھانا لے کر نکلتے تھے اور ہاں اگر کوئی رشتہ دار کہیں ریلوے اسٹیشن کے پاس اس کا گھر ہوتا تو وہ کھانا لے کر حاضر ہوتا۔مگر موجودہ دور میں اگر کسی کا گھر یا ہوٹل اسٹیشن کے اندر بھی ہو تو وہ زحمت گوارہ نہیں کرتا۔آج کے لوگوں میں بھائی چارگی اور خلوص کی نمایاں کمی دیکھنے کو ملتی ہے مگر اس دور کی مثال جو قرۃ العین حیدر کی پیش کی ہے وہ سب سے الگ اور منفرد ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

''نو بجے کے قریب ہماری گاڑی روانہ ہوئی۔ راہ میں راوَلپنڈی ، گجرات، لاہور، امرتسر وغیرہ میں بعض تہذیبی بہنیں اسٹیشنوں پر ملنے آئیں۔بعض نے کھانا بھیجا بعض نے چائے

بعض تحائف لائیں۔''۸۷؎

یہاں ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندو مسلم اتحاد اپنی مثال آپ ہے نہ کسی ملک وقوم میں اس سے پہلے تھی اور نہ بعد میں ہوگی۔ اسی اتحاد کی ایک مثال قرۃ العین حیدر کی والدہ سجاد حیدر یلدرم کی بیوی کے ایک منہ بولے ہندو بھائی بیلی رام کی ہے جو ان کو اپنی ہمشیرہ سمجھتا ہے اور جب نذر سجاد حیدر کراچی سے ہندوستان میں مسوری آئیں تو انہوں نے ان کو ایک خط لکھا جس میں قومی یکجہتی اور آپ بھائی چارے کے عناصر کچھ یوں ملتے ہیں:۔

''راولپنڈی''

۲۰؍جون ۱۹۱۲ء

میری پیاری ہمشیرہ

خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دعا دیتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس دور دراز سفر کو طے کر کے بخیریت تمام مسوری پہنچی ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ میری پیارے بہن میرے اسٹیشن سے گذرے اور میں کچھ اس کی خدمت نہ کرسکوں۔ لیکن یہ امر مجبوری تھا۔ اگر میں پہلے سے موجود ہوتا تو تل پھل سے آپ کی سیوہ کا فخر حاصل کرتا۔ بڑھیا نے مجھے خط دینے کے بجائے لالہ برج لعل تھاپڑ کے حوالے کیا۔ جس نے پڑھ کر مجھے واپس کیا۔ میں آپ کے اسباب کی بلٹی کرنے ٹکٹ وغیرہ لینے میں مشغول دیا۔ ایک حرف بھی لکھ کر آپ کی سیوہ میں پیش نہ کرسکا۔ امید ہے معاف فرماؤ گی۔

بہن۔ رخصت کے وقت کو ہاٹ میں آپ دو رہی تھیں۔ ادھر میرا کلیجہ بھی پاش پاش تھا اور آنسو برابر جاری تھے کیونکہ اس خادم کو آپ کے کنبے کے ساتھ غیر معمولی محبت ہے۔

میں میر صاحب کواپنا بھی پاپا سمجھتا ہوں اورآپ میری دو بہنیں ہیں اور چھوٹے میاں خدا سلامت رکھے میر چھوٹا بھائی ہے ۔ بھابھی جی سرگباش ہوچکی ہیں وہ میری والدہ تھیں جو مجھے ہروقت یاد آتی ہیں اور میں سچے دل سے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں کہ اس دیوی کو خدا سورگ نصیب کرے۔ میرا سہارا یا تو خدا پر یا میرے پاپا میر صاحب پر ہے۔اس دنیا میں میں اکیلا صرف آپ لوگوں کے بھروسے پر جی رہاہوں ۔آپ مہربانی فرما کر بھائی سجاد حیدر سے عرض کریں کہ وہ بھی اس دھرم کے رشتے کو بنھائیں۔ میں آپ لوگوں کا تا عمر خادم ہوں۔آئندہ مارچ کو میرا ادارہ ہردوار آنے کا ہے ۔اگرحالات نے اجازت دی تو آپ کے درشن کو بمع اپنی بیوی کے حاضر خدمت ہوں گا۔ بہن جی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو بلا تکلف مجھے لکھ دیں میں اپنی نیبھا شکتی کے انوساداس کی تعمیل کروں گا۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ کی تمام زندگی ہمیشہ خوشی میں گذرے جس کی ٹھنڈی ہوا مجھے بھی آتی رہے۔

بہن جی اگر آپ برانہ مانیں تو ایک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر روز شام کو بھائی سجاد حیدر کے ہمراہ ہوا خوری کے لئے ضرور تشریف لے جایا کرنا۔آپ کی طبیعت چونکہ کمزور ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چلنے پھرنے سے اچھی صحت ہوگی ۔ویسے آپ کے پردہ سسٹم میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ میری ناقص عقل نے یہ محسوس کیا ہے۔

بھائی سجاد صاحب کو دست بستہ آداب عرض کریں۔

آپ کا ناچیز بھائی

بیلی رام۸۸

بیلی رام کے اس خط میں اوّل تا آخر تک قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔ وہ حقائق اور دلائل جو قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے کافی ہوتے ہیں وہ صرف اس ایک خط جو بیلی رام نے قرۃ العین حیدر کی ماں نذر سجاد حیدر کو لکھا تھا کافی ہیں۔ بیلی رام کا نذر سجاد حیدر کے پریوار کو اپنا پریوار بتلانا اور پھر انکے سامان کا بلٹی کروانے کے باوجود ان سے اچھی طرح نہ ملنے کو معزوری بتانا ہے اور یہ کہنا کہ میں ''ایک حرف بھی لکھ کر آپ کی سیوہ میں پیش نہ کرسکا۔'' بہت بڑی بات ہے۔ بیلی رام جب یوں کہتا ہے کہ '' آپ میری دو بہنیں ہیں اور چھوٹے میاں خدا سلامت رکھے میرا چھوٹا بھائی ہے'' یہ یہاں کی قدیم تہذیب کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے کہ کس طرح یہاں دوقوموں کا آپسی بھائی چارہ مشہور تھا۔ نذر سجاد حیدر کو اس سلیقہ اور ہنر مندی کے ساتھ مشورہ دیتا کہ ''بہن جی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر روز شام کو بھائی سجاد حیدر کے ہمراہ ہوا خوری کے لئے ضرور تشریف لے جایا کرنا'' بیلی رام کی یہ اپنی بہن کو عرض ہے یا نصیحت اس میں یہاں فرق کرنا تھوڑا مشکل ہو رہا ہے۔ اس دور میں اگر کوئی کسی کو ہوا خوری کے لئے کہتا ہے تو ذرا انداز اور لہجہ مختلف ہوگا یا یوں کہے گا کہ تم walk کیا کرو مگر بیلی رام نے ان کی طبیعت اور سجاد حیدر کا خیال رکھتے ہوئے کہنا کہ ان کے ساتھ ہوا خوری کرنا بہت بڑی بات ہے۔

اسی طرح مصنفہ نے آگے یہاں کے ہندو مسلم اتحاد کی اور کئی مثالیں دی ہیں جو اعلیٰ سطح پر بھی بہت اہمیت رکھتی تھیں مثلاً ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین معاہدہ ہو رہا تھا مگر انگریز اس اتحاد کے بہت خلاف تھے اور انہوں نے یہ معاہدہ نہیں ہونے دیا مگر

یہ معاہدہ بھی عالمی سطح پر ہندو مسلم اتحاد کا واضح اشارہ تھا جس کو قرۃ العین حیدر نے یوں رقمطراز کیا ہے:۔

''۱۹۱٦ء میں کانگریس اور لیگ کے مابین معاہدہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں علی محمد خاں راجہ محمود آباد کو انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ لیگ اور کانگریس کا یہ اتحاد برطانوی حکومت کی مصلحت کے بالکل خلاف تھا۔''نواب سرہاد کرٹ بٹلر نے راجہ صاحب پر زور ڈال کر انہیں کانگریس کی صدارت قبول کرنے سے روک لیا قومی سیاست سے علیحدہ کرنے کی غرض سے مہاراجہ اور سر کا خطاب دلوایا اور یو۔پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر مقرر کردیا۔ گویا ترکی ٹوپی سے انگریزی ہیٹ پھر جیت گئی۔۸۹؎

گویا ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے انگریز حکمران کتنے مخالف تھے۔ یہاں کی قوم کی خصوصیت رہی ہے کہ یہ آپس میں سمجھوتہ کرنے کے لئے صدیوں سے مشہور رہی ہے یہاں ہزاروں حملہ آور آئے جنگ وجدل ہوئے مگر ہر بار ایک نیا اتحاد ابھر کر سامنے آیا اور پہلے سے مضبوط اورمقبول بھائی چارہ قائم ہو مگر انگریز حکومت نے یہاں کی اس بھائی چارگی میں ایسا نفرت کا بیج بویا کہ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی 1947ء میں دھجیاں اڑ گئی اور جس کو دوبارہ قائم ہونے میں ایک عرصہ لگا۔1947ء سے پہلے یہاں ہندو مسلم ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی کی مانند

رہتے تھے کبھی کوئی فسادات رونما نہیں ہوا۔ اسی پرانی تہذیب کی قرۃ العین حیدر نے ایک مثال یوں پیش کی ہے:۔

''دفعتاً سامنے سے کنور نریش پرشاد آتے دکھائی دیئے۔ شوالے میں آرتی کے بعد پیشانی پر قشقہ لگوا زیر لب اشلوک پڑھتے ساحل کی ریت پر خراماں خراماں چلے آتے تھے۔ نزدیک پہنچے، پرانی ہندوستانی تہذیب کے پروردہ دونوں صاحبان جھک جھک کر آداب بجالائے۔ کنور صاحب نے افسردہ آواز میں دریافت کیا۔ ''میر صاحب کا ہم نے اخبار براعظم میں پڑھا حکومت ہند نے جنگی خدمات کے سلسلے میں آپ کو پنجاب کے اندر کئی مربع زمین پیش کی ہے۔ مگر آپ نے واپس کردی۔ لکھا ہے آپ نے فرمایا کہ میرا اکلوتا بیٹا مر گیا میں مربعے لے کر کیا کروں گا۔ یہ خبر درست ہے؟''

''جی ہاں کنور صاحب۔ بکری کی چھینک۔''

''جی''

''بکری کی چھینک بھائی صاحب۔ اور چینیوں کی طرح آستینوں میں ہاتھ اخلاقاً جھکے۔ کنور صاحب نے اور تردد سے انہیں دیکھا۔'' ۹۰؎

جب انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کو تقسیم کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے یہاں کی کمزوری جانچی جب ان کو کوئی کمزوری نظر نہ آئی اس کے بعد انہوں نے یہاں کے ہندو مسلم اتحاد کو زک پہنچانے کی کوشش کی جس میں وہ آہستہ آہستہ کامیاب بھی ہوتے دکھائی دیئے ہیں۔ اعلیٰ سطح پر ہمیں یہ بکھراؤ اتنا زیادہ نظر نہیں آتا جتنا تھا کیونکہ وہ لوگ اچھا شعور رکھتے تھے مگر نچلے طبقہ اس منافرت سے کسی حد تک نہ بچ سکا۔ پرانی وضعداریوں کی ایک مثال قرۃ العین حیدر یوں بیان کرتی ہیں:۔

''کہ یک بیک اس معطر عشرت کدے کی ہوا بدل گئی۔ ہوا کے رخ بھی بدلنے لگے مگر پرانی وضعداریاں نہ بدلیں۔ جواہر لعل نہرو مہاراجہ محمد آباد کو ان کے آخری وقت تک ''چچا'' کہا کئے۔''

سر ہا کرٹ بٹلر نے جواہر لعل نہرو کو جیل بھجوایا۔ مگر پنڈت موتی لعل نہرو سے دوستی کا دم بھرتا رہا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ اکیس سالہ عثمان حیدر مولانا محمد علیؒ کے ہمرکاب تھے۔ ''موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد۔ عمر سبحانی، سروجنی نائیڈو اور موتی لعل نہرو کے بھانجے جن کا نام شاید پنڈت کیلاش نرائن تھا ایک رات طعام شب پر سب موجود تھے، بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا ذکر نکلا۔ جواہر لعل نہرو نے سروجنی نائیڈو اور مولانا آزاد کو مخاطب کر کے دفعتاً کہا۔

صاحب وضعداری بھی بڑی چیز ہے۔ پچھلے دنوں میں لکھنؤ سے
آلہ آباد جارہا تھا۔ پرتاپ گڑھ کے اسٹیشن پر سجاد حیدر صاحب
مل گئے۔ وہ شاید سلطان پور جارہے تھے۔ اسٹیشن پر میری وجہ
سے زبردست ہجوم تھا۔ سجاد صاحب دوسرے اسٹیشن پر تھے۔
بھیڑ کے دھکے کھاتے تیز تیز چلتے آکر بڑی گرمجوشی سے ملے۔
میں نے کہا جناب مجسٹریٹ صاحب اب سی۔آئی۔ڈی آپ
کی مخبری کردے گی۔ ہنس کر فرمایا دیکھا جائے گا۔''[91]

اس بات چیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے سیاست داں بھی کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ رہتے اور ملتے تھے۔ حالانکہ نہرو اور سجاد حیدر یلدرم کا مذہب بھی اور نظریہ سیاست بھی الگ تھا۔ ایک آزادی ہند کے دیوانے کئی بار جیل میں جاچکے اور دوسرے مجسٹریٹ مگر اسٹیشن پر ملے تو بھائی چارے کے ساتھ حالانکہ نہرو جی نے کہا بھی کہ سی۔آئی۔ڈی آپ کی مخبری کردے گی اوران کو نوکری سے برطرف بھی کرسکتے تھے مگر ملنا اورمزاج پرسی کرنا یہاں کا تہذیبی اور سخاوتی فریضہ تھا جس کو پورا کرنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ یہ قومی یکجہتی اور اتحاد کا بڑا سنہرا دور تھا۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''کارجہاں دراز ہے'' میں پیش کیا ہے۔

اردو اور ہندی شروع میں ایک ہی زبان تھی۔ اور آہستہ آہستہ جب یہاں قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو زک پہنچانے کی کوشش کی جانے لگی تو اس وقت فرقہ وارانہ طاقتوں نے اس زبان کو بھی نشانہ بنانا شروع کیا اور پہلے اس پر یہ اعتراض

ہونے لگا کہ یہ فارسی اورعربی آمیزش زبان ہے اس کا یہاں ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لہٰذا یہاں کی مقامی زبان کوفروغ دیا جائے اب مقامی زبان کوئی اس قدر رائج تو تھی نہیں ۔ لہٰذا اسی ہندوی کو دو نام دیئے گئے ایک تو اردوکہلائی اور دوسری ہندی ۔ جس تحریر میں زیادہ مقامی زبانوں اورسنسکرت کے الفاظ ہوئے وہ تحریر ہندی کہلائی اورجس میں فارسی اورعربی کے زیادہ الفاظ ہوئے وہ تحریر اردو زبان کہلائی ۔ زبانوں کے معاملے میں یہ ایک ایسی پہیلی بنی تھی جس کومختلف لوگوں نے مختلف طرح سے سمجھانے کی کوشش کی ۔مصنفہ کے ایک کردار خالدہ خانم کی زبانی اس بحث کو کچھ یوں بیان کیا ہے:۔

’’ مشترک زبان کا حل میرے نزدیک یہ نہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے جونہ آج کی سخت اردو ہو اورنہ آج کل کی سخت ہندی۔ کیونکہ جب ایسی ریڈریں تیار کی جاتی ہےتو دونوں طرف سے اس پر اعتراض شروع ہوتے ہیں۔ اردو والے کہتے ہیں کہ مشترکہ زبان کے پردے میں ہندی کو رواج دیاجارہاہے ہندی والے کہتے ہیں کہ یہ تو وہی اردو ہوی ۔ میرے نزدیک اس مشکل کاحل یہ ہے کہ ہر طالب علم کو اردو اور ہندی دونوں زبانی سیکھنے پر مجبور کیا جائے پھر آہستہ آہستہ خود گھلی ملی زبان پیدا ہوجائے گی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے اردو کے ایم اے کی نصاب میں اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ہندی کا ایک لازمی پرچہ بھی رکھاہے۔‘‘۹۲

دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''شاید یہ کہاجائے کہ طالب علم پر کتنی زبانیں سیکھنے کا بار ڈالا جائے گا۔اس کا میرے پاس یہ جواب ہے کہ اردو اور ہندی مختلف الاصل زبانیں نہیں ہیں۔ جب جنوبی افریقہ میں ڈچ اور انگریزی اور کنیڈا میں فرنچ اور انگریزی دویا بالکل جداجدا زبانیں میں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ہندی جو حقیقت میں ایک ہی زبان میں کیوں ساتھ ساتھ نہ چل سکیں گی۔

ہندو مصنّفین سے میری درخواست ہے کہ وہ ایسی اردو لکھیں جیسی میرے درینہ محبّ مکرم منشی دیا نرائن نگم صاحب ، پنڈت کول، پنڈت زتشی لکھتے ہیں۔مسلمان ایسی لکھیں جیسے سید سلمان ندوی ، مولوی عبدالحق، حسن نظامی ، ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں کاش منشی پریم چند جیسے مصنّفین ہم میں پیدا ہوں جن کی قادر الکلامی اردو اور ہندی زبانوں پر یکساں تھی اور جنہیں اردو اور ہندی اپنا سب سے بڑا ادیب شمار کرنے میں مسابقت کررہی ہیں۔'' ۹۳

ہندوستان میں ایک زمانہ ایسا تھا جب قومی یکجہتی کی ایسی مثالیں ملتی تھیں کہ ہندو مسلم ہندی اور اردو تو کیا سنسکرت اور فارسی میں بھی کوئی اعتراض نہ جتاتے تھے بلکہ بڑے بڑے فارسی کے ہندو علماء تھے اور سنسکرت میں مسلمان تھے زبان کا کسی کو کوئی اختلاف نہ تھاا وران دونوں زبانوں کے میل ملاپ سے ایک نئ زبان وجود میں آئی جس کا نام ہندوی رکھا گیا کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ دونوں قوموں نے اس نئ زبان کی آبیاری کی

مگر جب انگریز ہندوستان میں آئے اورانہوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی تو اس وقت زبانوں کا مسئلہ پیدا کیا گیا کہ ہندوؤں کی کون سی زبان ہونی چاہیئے اور مسلمانوں کی کون سی زبان ہوگئی پھر آگے چل کر زبانوں کی تقسیم ہوئی اور ہندی اور اردو میں فرق ڈھونڈنے شروع کیئے گئے اسی ہندوی میں جس میں سنسکرت کے زیادہ الفاظ ہوں وہ ہندی کہلائی اور جس میں فارسی کے زیادہ الفاظ ہوں وہ اردو کہلائی ۔ اب ادیبوں کی باری آتی ہے اور مشترکہ ادیب جو شروع شروع میں ہندوی میں لکھتے تھے وہ بھی دونوں زبانوں میں مشترکہ ہیں مگر آگے چل کر اپنے اپنے ادیب پیدا ہونے شروع ہوئے ۔اسی وقت منشی پریم چند جیسا ادیب پیدا ہوتا ہے ۔ جس کو اردوا ور ہندی والے دونوں اپنا اپنا ادیب کہتے اور کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسی بات کو قرۃ العین حیدر نے یوں کہا ہے کہ کاش ہمیں پریم چند جیسے دو چار اور ادیب مل جاتے جو مشترکہ تہذیب مشترکہ زبانوں میں لکھتے اور جس کو دونوں زبانیں اپنا اپنا ادیب کہلوانے میں مسابقت کرتی ۔

مصنفہ جس ماحول میں پڑھی اور بڑی ہوئی اُس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کا ایک اہم دور تھا وہ جب یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی تو ایک ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں کا شیڈول یہ تھا کہ باورچی خانے میں لڑکیوں کو بھی باری باری کام کرنا پڑتا تھا جب قرۃ العین حیدر کی باری آئی تو انہوں نے کھانے کی Quality تھوڑی سدھاری جس کی وجہ سے بل زیادہ آ گیا اور ان کو کافی ڈانٹ وغیرہ پڑی مگر انہوں نے کہا کہ وہ کھانے کا بل سب کا خود ادا کردیں گی حالانکہ بعد میں وہ انہوں نے نہیں دیا جس کو مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے:

''بریانی کی شانِ نزول یہ تھی ، ہوسٹل میں ہر پندر واڑے ایک ایک لڑکی باورچی خانے میں انتظام کرتی تھی ان دونوں میری باری تھی اور گوشت خور اور سبزی خور دونوں اقسام کی لڑکیوں کو ایک سے ایک بڑھیا کھانے کھلوا رہی تھی۔ جب مہینے کے آخر میں سب کے معمول سے دوگنے بل بنے صبح صبح رام لال بیرا نے آکر آواز دی'' بابا آپ کو میم صاحب بلاوت ہیں۔''

مسز وانچو اپنے دفتر میں پریشان بیٹھی تھی کہنے لگی۔ میں نے یہ بل ابھی روک لئے ہیں۔لڑکیاں معمول سے دوگنی رقم ہرگز نہیں دیں گی۔تم نے اتنی فضول رقم خرچ کیوں کی؟''

عرض کیا: سال بھر میں دو ہفتے لڑکیوں نے پیٹ بھر کے اچھے کھانے کھا لئے تو کیا غضب ہوگیا۔''

بحثیت ایک کشمیری برہمن مسز وانچو خود خوش خوراک تھیں۔ یہ نقطہ نظر سمجھتی تھیں لیکن کہنے لگی ، وہ تو ٹھیک ہے مگر ....''

میں نے شان استغنیٰ سے جواب دیا۔لڑکیوں کا معمول کا بل بھیج دیجئے ۔سب کا سر پلس دو پیہ میں بھردوں گی۔''

شکیلہ ،آصف، ای نڈ، میروز ،عزیز بانو داداب اور پریم لتا گردور نے چنڈو خانے کی بقیہ اراکیں کو ایک شاہ بلوٗ کے نیچے جمع کیا۔انہوں نے کہا فکر مت کرو۔اپنا بل ہم خود ادا کردیں گے۔لیکن باقیوں کے لئے کیا کیا جائے۔

میں نے مراقبے سے آنکھ کھول کر جواب دیا۔''اللہ میاں فتوح کا انتظام کر چکے ہیں۔ سائیکلیں نکالو اپنی اپنی۔''ہم سب سائیکلوں پر بھاگم بھاگ امپریل بنک پہنچے مبلغ چار سو کا وہ چیک جو''ستادو سے آگے''نامی مجموعے کے جملہ حقوق کا دہلی سے صادق الخیری نے چند روز قبل بھیجا تھا بھنوایا۔ واپس آ کر مطلوبہ رقم مسز وانچو کو پیش کی۔انہوں نے سر ہلا کر افسردگی سے کہا۔''اب مجھے معلوم ہا کہ مسلمان قوم کیوں تباہ ہوئی۔ محض زبان کے چٹخارے کی خاطر۔''۹۴

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا کہ قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں بھی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔

آخر شب کے ہم سفر(1979ء)

''آخر شب کے ہم سفر'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا ناول ہے۔ جو ۱۹۷۹ء میں چودہدری اکیڈمی لاہور سے پہلی بار شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریک اور اس سے رونما ہونے والے انقلاب کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں نچلے طبقے جو اس دور میں واضح شکل اختیار کر چکا تھا اور پرانے معاشرے سے آزاد ہوکر پوری آب وتاب کے ساتھ معاشرے میں اپنے وجود کا احساس کرا چکا تھا کو بھی قرۃ العین حیدر نے واضح کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول''آخر شب کے ہمسفر'' کی شروعات ایک ڈاکٹر بنوئے چند

سرکار کے گھر سے ہوتی ہے۔ دیپالی اس کی بیٹی ہے جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے ۔ دیپالی اپنے گھر میں ہی چوری کرتی ہے اور تین قیمتی ساڑیاں چرا کر بیچ دیتی ہے ۔اس کی ایک اور سہیلی اوما بھی اس ناول کا دوسرا بڑا کردار ہے۔ جو لندن میں تعلیم حاصل کرتی ہے اور مارکسی انقلاب سے بہت متاثر ہے۔اس کا دوست ریحان ہے جو اس کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہے ریحان ایک مڈل کلاس لڑکا ہے۔ دیپالی کا تعلق اپنے دور کی دہشت پسند تحریک سے تھا۔ روزی ایک دوسرا کردار وہ بھی دیپالی کے گروہ میں شامل ہوجاتی ہے ۔ یوں یہ تین سہیلیاں تین کردار اس ناول میں مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں آرا مسلم ہے دیپالی ہندو اور روزی عیسائی ہیں۔ یوں یہ تینوں مذاہب سے تعلق رکھنے والے کردار زندگی اورمسائل سے یکساں نبرد آزما تھے ۔ یہ وہ تہذیب تھی جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تمام تخلیقات میں برتا کیونکہ یہ تہذیب ان کی اپنی تہذیب تھی جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔ یہ تہذیب قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کی نمائندہ تھی۔ قرۃ العین حیدر اپنے ابتدائی ناولوں میں جب بھی بات کرتی ہیں اُن میں سبھی قوموں کے کردار ہوتے ہیں خواہ وہ'' میرے بھی صنم خانے''ہو یا پھر'' آگ کا دریا' اور اب یہ ناول'' آخر شب کے ہمسفر'' انہوں نے تمام کے تمام میں مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کی ہے۔اس پارٹی میں اوما رائے بھی ہے دیپالی، روزی بھی اور ریحان الدین احمد بھی ہیں نہ تمام لوگ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس پارٹی کو انگریزوں نے دہشت گرد جماعت قرار دیا ہے ۔ اوما رائے اور ریحان لندن میں اکٹھے پڑھتے تھے اور وہی سے ان کی دوستی ہوئی اس کے بعد

دیپالی اس گروپ میں شامل ہوتی ہے۔ اور اوما سے اس کی ملاقات اسی کے گھر میں ہوتی ہے وہ اس کے گھر کی شان وشوکت دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے اور سوچتی ہے:۔

''اتنی دولت مند اوما دیوی تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتی۔
جب ضرورت پڑتی ہے تو ہم جیسے غریب کارکنوں کو اپنے گھر میں
سیندھ لگا نا پڑتی ہے۔ اکٹھے وہ ٹیوش کرتے ہیں۔ سیندر مزور ہے
۔محمود الحق پریس میں پروف ریڈر ہے اور دن رات اپنی کمزور
آنکھیں پھوڑتا ہے۔ اسی طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب کچھ لاکر
تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔''۵۸؎

جہاں ایک قرۃ العین حیدر نے اس اونچے طبقے کی عکاسی کی ہے وہیں یہ بھی بتایا ہے کہ اوما اتنی امیر ہونے کے باوجود کس طرح نچلے طبقے کے ساتھ جڑی ہوتی ہے کہ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔ دیپالی اور ریحان ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طبقے کی نمائندگی کے ساتھ ساٹھ وہ کمیونسٹ پارٹی کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ سماجی میں موجود طبقات کے درمیان یہی کشمکش قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بھی نمایاں ہوکر سطح پر آجاتی ہے اور اسی کشمکش کی ایک مثال دیپالی سرکار ہے جو اوما دیوی کی حالت کو دیکھ کر اپنے طبقے کی مشکلات کا تجربہ کرتی ہے اور میزبان جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ریحان الدین احمد میں کی مسرت کا جائزہ بھی لیتی ہے:۔

''دیپاولی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا وہ سفید پوش

طبقے کی ناداری سے واقف تھی، جو اس کی اپنی ناداری تھی۔ اس
نے شہر کے غرباء کا اخلاص دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک
نظر نہیں آئی تھی۔'' ۵۹

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں بتایا ہے کہ کس طرح یہاں بھائی چارگی اور رواداری کا ماحول تھا۔ دیپالی جو کہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے کس طرح اس کا پلا اونچے طبقے سے بھی پڑتا ہے اور نچلے طبقے سے بھی۔ نچلے طبقے کے ساتھ دیپالی نے کافی عرصہ گذارا اور انہوں نے اس کی خوب خاطر تواضع بھی کی حالانکہ دیپالی ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھی مگر اس بات کا احساس اس کو ریحان الدین کے گھر رہتے ہوئے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ یہ یہاں کی قوم کی اور آپسی بھائی چارے کی ایک بڑی اور اہم علامت ہے جو قرۃ العین حیدر نے یہاں اپنی اس تخلیق ''آخر شب کے ہمسفر'' میں بیان کی ہے۔ایک اور جگہ ایک اسکول کی ٹیچر مسز بوس کو بتایا ہے کہ کس طرح جب دیپالی کی سلیکشن ایک کمپنی میں ہوتی ہے تو اس خوشی میں وہ کلاس کی چھٹی کر دیتی ہیں جس کو قرۃ العین کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہیں:۔

''مسز بوس ایک نیک دل اور شریف خاتون تھیں۔ انہوں نے
ذرا جھلا کر روزی کو گھورا اور باقی ماندہ کلاس کی حاضری لگانے کے
بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ ولہجہ اختیار کر کے سامنے دیکھتے
ہوئے کہا۔''صفحہ ۲۱۸ کھولو............ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ
۱۹۳۵ء''

پلیز...... پلیز...... پلیز۔''

''چاؤ............ بھاگو............ منھ جلی چڑیلیں......'' آدھ گھنٹہ
پڑھانے کے بعد مسز بوس نے خصوصی غصے کے ساتھ کتاب زور
سے بند کی۔ لڑکیاں بھد بھد کرتی کمرے سے باہر نکل کر باہر
گھاس پر بکھر گئیں۔''۶۰؎

حالانکہ دیپالی ایک عارضی نوکری کسی کمپنی میں کرنے کے لئے جارہی ہے مگر مسز بوس اور کلاس کی دوسری لڑکیاں کتنی خوش ہیں۔ اس اقتباس میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی تہذیب و کلچر کی نمائندگی کی ہے کس طرح دوسرے کی خوشی میں یہاں کے تمام لوگ شریک ہوتے ہیں خواہ وہ کسی بھی فرقے تنظیم یا مذہب کا ہو مگر ایک دوسرے کی خوشی مشترکہ ہوتی ہے۔ چاہتے وہ کسی بھی سماج سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو مگر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی یہاں کی عوام کا ہر دور میں شیوہ رہا ہے یہاں کے لوگ قدامت پرست ہیں اس کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''آخرشب کے ہمسفر'' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:۔

''بیرسٹر رائے برہمو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان
چودھری پریواروں کی مانند زمیندار تھے۔ اور مذہبی لحاظ سے
قدامت پسند ہندو۔ زیادہ ثروت، سین اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں
برہمو ہو چکی تھیں۔ لیکن بیرسٹر رائے کے دادا کیشپ چندر سین کے
چیلے بن گئے تھے۔ اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی سے
برہمو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹر رائے کی والدہ اور پھوپھیوں تک

نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔۱۶

قرۃ العین حیدر نے بتایا ہے کہ کس طرح یہاں کے لوگوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ قائم تھا کسی طرح لوگ مذہبی رنگ میں کبھی نہیں رنگے ہاں اپنی مذہبی رسومات ضرور پوری کرتے تھے اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرنا اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ تبھی تو یہاں کی جنگ آزادی میں سبھی قوموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آزادی حاصل کی ۔ یہاں برابر لوگ سولی پر چڑھائے گئے ۔شانہ بشانہ ہندو مسلم آزادی کی خاطر لڑے بغیر کسی بھید بھاؤ کے جس کی مثال قرۃ العین حیدر یوں دیتی ہیں:

''عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۴ء میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ اور پھانسی کی کوٹھریاں آباد ہوئیں۔ یوپی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اوراشفاق اللہ اور اس کے ساتھی پھانسی پر چڑھے۔ اندھیرا میں الوری سیتارام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے پھرے اور مارے گئے ۔سردار بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشترا کی حکومت قائم کرنا ہے ۔ اور پھانسی پر چڑھے۔ ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر الٰہ آباد میں پولیس سے لڑے اور مارے گئے ۔ چاٹ گام میں ۲۲/اپریل ۱۹۳۰ء کو آئر لینڈ کے ایسٹر سنڈے کی طرح کی معرکہ آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی ''نو جوان ترک پارٹی'' جگاتر

نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جگانتر کے لیڈر سوریہ سین
اوران کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ
کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہوگئے ۔ نو جوان کلپنا دت
کوقید کرلیا گیا ۔ کماری بینا داس نے بنگال کے گورنر پر گولی چلا
دی۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس
اورسیشن جج علی پورسب کوموت کی گھاٹ اتار دیا گیا ۔ضلع مدناپور
کے تین انگریزی جج ایک کے بعد ایک مارے جاچکے تھے ۔
یورپین ایسوسی ایشن کے پرزیڈنٹ ، اسٹیٹمین کے ایڈیٹراورسرچارلس
ٹیکارٹ پر قاتلانہ حملہ افسوس کے ناکام رہے تھے ۔''[۶۲]

قرۃ العین حیدر نے مندرجہ بالا سطور میں جہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر گنوائے ہیں وہاں انھوں نے اس مشترکہ قوم کی بات بھی کی ہے جس نے جنگ آزادی کی خاطر اپنی جانیں گنوادی اور اُف تک نہ کی ۔ ان کے ماؤں نے اس جنگ آزادی کی خاطر اپنے لخت جگر کوسولی چڑھتے دیکھا اور سینے پر گولیاں کھاتے دیکھا ہے ۔ یہاں اُس وقت کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی جیسے آج اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی ہے ۔کبھی گائے کی سیاست اور کبھی مسجد مندر کی سیاست ، اُس وقت صرف اورصرف ایک مقصد تھا اور وہ مقصد آزادی حاصل کرنا تھااوران چند سطور میں قرۃ العین حیدر نے پوری آزادی کی لڑائی اور اس میں شمولیت کی تاریخ کو پیش کیا ہے ۔ انھوں نے کسی مذہب کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی کسی فرقہ کے لوگوں کی مخالفت کیں بلکہ ہندوستان اور ہندوستانی قوم کی بات

کی۔ اس آزادی کی خاطر کتنے ہندو اور مسلمانوں نے قربانیاں دی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے بتایا ہے کہ کس طرح یہاں مختلف پارٹیاں اور تنظیمیں بنیں اور ان میں مشترکہ لوگ یعنی ہندو مسلم سکھ تمام مذاہب کے لوگ شریک تھے جو صرف اور صرف ملک کی آزادی کی خاطر انگریزوں سے لڑتے تھے۔ اسی طرح ملک میں مذہبی پارٹیاں بھی تھی جس میں نو جوان ترک پارٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس لوگوں کا مقصد ملک تو تقسیم کرنا نہیں بلکہ صرف ملک کو آزاد کروانا تھا۔ انگریز نہ صرف یہاں قبضہ کرے بیٹھے تھے بلکہ وہ ملک کو اقتصادی طور پر بھی کمزور کر رہے تھے۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے ریحان کی زبانی کچھ ایسے بیان کروایا ہے:۔

> ''نہیں...... جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہوسکتی ہے وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ سنو دیپالی۔ یہ یادرکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان کے قحط، غلامی اور فرقے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہی کھلنا اور نواکھالی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے دولتمند تجارتی علاقے تھے؟ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک جو سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئیں تھیں۔'' ۶۲؎

قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے ذریعے ایک طرف جہاں بنگال کے حالات پر تبصرہ کیا ہے وہی دوسری طرف انگریز حکومت کے زیر اثر ہندوستان پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد ملک میں آزادی کے بعد کے حالات کو بھی بڑی فنکارانہ انداز میں اس ناول میں جگہ دی ہے ۔ جہاں ایک طرف آزادی کے بعد ملک میں جگہ جگہ فتنے فساد اور قتل وغارت کا ماحول پیدا ہواوہی اسی آزادی کے دوران جب ایک بار دیپالی ریحان کے ساتھ مولوی ابو الہاشم کے گھر ٹھہری تھی تو ان کی ہمدری اور بھائی چارگی کو بھی قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں جگہ دے کر بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہاں ہمارے ملک میں دوسرے کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھنے کی روایت تھی۔ ہاشم کی بیوی جس کے پاس صرف ایک ہی ساڑی تھی وہ بھی اس نے دیپالی کو دے دی اور جب ریحان نے لینے سے انکار کردیا تو وہ کس طرح رونے لگی اور کہنے لگی کہ ہم غریب ہیں شاید اسی لئے آپ ہمارا تحفہ قبول نہیں کر رہے ہو:۔

''چلو بیٹی کولثم ....مولوی ابو الہاشم نے اسے آواز دی ۔ وہ اور زینت بی بی اسے باضابطہ کلثوم ہی پکارتے تھے ۔ انہیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریحان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہوکر اس سے نکاح کرئے گی۔ جانے ریحان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا پٹی پڑھا رکھی تھی ۔ زینت بی بی نے تو ایک رات ریحان سے بڑی راز داری سے کہا تھا کہ کلثوم کو مولوی صاحب کلمہ پڑھادیں گے اور شربت کے پیالے پر نکاح ہوجائے

گا۔ یوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ اس بیچاری
نے برسوں سے نیت کر رکھی تھی ایک نئی سول ساڑی بھی نکال کر
ریحان کو پیش کردی تھی۔ یہ ساڑی اُنہوں نے اپنی بہو کے لئے
رکھی تھی ۔اور جب ریحان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں
جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے۔ تب بھی وہ یہ ساری
اپنی طرف سے تحفہ دینے پر مصر رہی تھیں۔ ریحان کے انکار پر
انہوں نے کہا تھا۔ہمیں غریب سمجھ کر ہم سے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے
ہو بھیا اور رونے لگی تھیں۔'' ۶۴؎

قرۃ العین حیدر نے زینت بی بی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہمارے ملک میں ہماری تہذیب میں یہ روایت رہی ہے کہ اپنی بیٹی سے بڑھ کر دوسرے کی بیٹی کی عزت اور مدد کی جاتی ہے ۔زینت بی بی کے پاس ایک ہی ساڑی تھی جسے اس نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے خریدا تھا مگر جب دیپالی اُس کے گھر میں رہی تو وہ کسی طرح اس ایک ساڑی کی پیشکش بھی کر دیتی ہے اور ریحان کے انکار پر رونے لگتی ہے ۔ حالانکہ وہ بہت مفلس تھی مگر تحفہ دینے کے لئے کتنی جدو جہد کرتی ہے یہ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی جس کو قرۃ العین حیدر نے زینت بی بی کے ذریعے اس ناول میں پیش کیا ہے۔

ڈھاکہ کے آثار قدیمہ بھی اس مشترکہ تہذیب کے عکاس ہیں جہاں آپسی بھائی چارگی برسوں برس تک قائم رہی اور اب جب بنگال تقسیم ہوا تو اس قومی یکجہتی اور آپسی بھائی

چارگی کو ٹھیس لگی جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:۔

انشاء اللہ ......'' اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر کسی سوچ میں کھو چکے تھے ۔ دیپالی نے ان کے خیالات میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اور دیوار پر لگے واٹر کلرز کو دیکھنے لگی۔ ڈھاکہ کے آثار الصنا ید .... قلعہ لال باغ، ست گنبد مسجد۔ بی بی پری کا مقبرہ۔ حسینی دالان۔''

نواب قمر الزمان بنگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں ۔

''دیپالی نے سوچا ۔ اور اسے یاد آیا۔اس کے جنم بھوم ہمسن سنگھ کے وسیع وعریض سرسبز علاقے میں ہندو اور بودھ بنگال کے پر افسوس اور لرزہ خیز، کھنڈر بھی موجود ہی تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلامی ماضی کی وراثت کا آپسی میں کوئی رشتہ نہیں ....''[۶۴]

قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کے عناصر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتے ہیں کہ جب ملک تقسیم ہوا۔ تو ایک طرف تو جہاں قتل غارت اور افراتفری کا ماحول تھا تو دوسری طرف آدھی ہندوستانی آبادی اس تقسیم سے نالاں اور سخت پریشان تھیں۔ یہ لوگ ادھ نصف ہندوستانی آبادی اس تقسیم ے خلاف تھیں۔ یہ لوگ اس پرانی تہذیب کو تقسیم اور برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ وہ مشترکہ تہذیب جس کی آبیاری کرتے صدیاں گذری تھیں اور اب وہ تہذیب تقسیم ہو رہی تھیں۔ لوگ اپنی اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر دوسرے ملک

یا علاقے میں نہیں جانا چاہتے تھے ۔ یہاں کے کھنڈر بھی سانچے تھے جن کو چھوڑ کر دیپالی خوش نہیں تھیں اور وہ سوالیہ انداز میں پوچھتی ہے کہ کیا ہماری ماضی کا یہ مسلمان حصہ نہیں ہیں اور دیپالی کی تقریر سن کر نواب صاحب کو بہت غصہ آیا تھا کیونکہ دیپالی کے والد نواب صاحب کے دوست تھے ۔ اور نواب صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے لہٰذا نواب صاحب دیپالی کو اپنی بیٹی سمجھتے اور کچھ اس انداز سے نصیب کرتے ہیں:۔

'' نواب صاحب نے ذرا اداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے............''میں بھول گیا تھا کہ تم اس سر پھرے بیچارے دنیش کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سر پھیری ہوگی۔ مگر آج ایک نصیحت کرتا ہوں ۔قومی جدو جہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمہارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑی قربانی دے چکے ہیں۔''

''قربانی............'' دیپالی نے ہنس کر کہا ۔ تیاگ اور قربانی تو اس دیس کی پرانی روایت ہے کا کا۔ گوتم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو تک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیاگ اور قربانی ...... تیاگ اور قربانی............''

''ہوں......''نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے ۔

''نہیں کا کا'' دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجئے'' ۶۵

یہاں دیپالی کی زبانی قرۃ العین حیدر یہ بتانے چاہتی ہیں کہ وہ ملک تقسیم کے کس قدر خلاف ہیں وہ چاہتی ہیں کہ ملک متحد رہے کیونکہ انہوں نے اس مشترکہ تہذیب میں جنم لیا تھا جہاں ہندو مسلم ایک تھے ان کی تہذیب مشترکہ تھیں جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر تھے۔

جب انگریز ہندوستان بھی آئے تو یہاں حکومت کرنے کے لئے انہوں نے چند لوگوں کو خرید لیا۔ان سے جو کام ہو کرواتے تھے اور ان لوگوں نے اور بعض دوسرے لوگوں نے انگریز کلچر تہذیب اپنالی مگر بظاہر ہی ان کا دل انس کلچر اس تہذیب کو نہ اپنا سکا جس کی مثال قرۃ العین حیدر نے راجہ گو کے ذریعے کچھ یوں بیان کی ہے:۔

''راجہ گو اتنا مغربی ہو چکا تھا مگر دل سے اصلیت میں ایکدم بلیک ٹیٹو تھا۔ دھوم دھڑ کے کارسیا۔ ہزاروں خوشامدی ،حوالی موالی، ناچ گرلز، سازشی مصاحب بھکاری ، پروہت ، گھوڑے ہاتھی اپنے ساتھ رکھتا تھا ۔ گوفلیوٹ بجانا مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری کو ترجیح دیتا تھا۔مگر کری اینڈ واس پر مرتا تھا۔ ان خصائل سے اس کے کردار کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے اور راجا کرشنما ہاوڈی ڈو دراصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا وفادار رہا۔'' ٦٦

یہاں کی قومی یکجہتی پوری دنیا میں مشہور رہی ہے۔آزادی حاصل کرنے کے لئے یہاں کے لوگوں میں اگرچہ انگریزوں نے ایک دوسرے کے خلاف ان لوگوں کو اکسایا کیونکہ ان کا مقصد ہی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو تھا مگر اسکے باوجود یہاں کے لوگ بھائی

چارگی قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ۔ یہاں کے سنگیت ایک تھے ۔ یہاں کے گیت ایک ہیں جب ملک میں انقلاب آیاتو اس وقت بھی لوگ ہندومسلم گیت سنگیت کی بات نہیں کرتے تھے بلکہ ان قلم کاروں اورفنکاروں کی برابرعزت کرتے تھے ۔آج بھی رفیع اورلتا اتنے ہی دونوں قوموں کےعزیز ہیں جتنے پہلے تھے ۔ غلام علی پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ہندوستانیوں کے دل میں بستا ہےایسا ہی ایک کردارقرۃ العین حیدر نے نذرالاسلام بنایا ہے جوانقلاب کے دوران چھایا ہوا ہوتاہےاورسارےانقلابی چاہتے وہ ہندو ہوں یامسلم بھی ا س کے گیت گاتے ہیں اورجس کے گانے ڈرامے پورے ملک میں گونج رہے تھےاس کوقرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:۔

''انقلابیوں کے گیت............''بسے گا ہندو پیچھے کو بسے گا انڈمان آگے'' نذرالاسلام کےطوفانی گانے ، ڈرامے ،عوامی ناٹک ، گرینڈ ڈیڈ اور ایڈور ڈبالوکا بنگال ان آتشیں آوازوں سے گونج رہا ہے ۔ یہ انقلابی واقعی بڑے بےصبری لوگ تھے ۔اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف تین چھٹانک چاول اور دو چھٹانگ چنااان کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتاتھا۔ اورحیرت انگیز صعوبتیں اٹھاکر یہ ہم سےلڑ رہے تھے ۔

اشلوک رٹتے اورنمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے ۔

۶۷

قرۃ العین حیدر جب بھی اپنی کسی تخلیقات میں بات کرتی ہیں تو اکثر ہندومسلم دونوں

تہذیبوں کی بات کرتی ہیں چونکہ یہ ان کی مشترکہ تہذیب ہے جہاں وہ ہندو کے اشکوک رٹنے کی بات کرتی ہیں۔ وہی مسلمان کے نماز پڑھنے کی بھی بات کرتی ہیں جہاں وہ مندر کی بات کرتی ہیں تو ساتھ ہی مسجد کی بات بھی کرتی ہیں اور یہی خاصیت ہماری زبان کی بھی ہے کہ جب ہم مسجد کی بات کرتے ہیں تو مندر کا نام بھی ساتھ آتا ہے جب ہم ہندو کی بات کرتے ہیں تو ساتھ مسلمان کا نام بھی آتا ہے کیونکہ یہ ملک سانجی تہذیب کا مسکن رہا ہے اور ہے بھی اس لئے یہ سب باتیں لازم وملزوم ہیں ایک اور جگہ بنگال کی تہذیب کے بارے میں دیپالی کی زبانی کچھ اس طرح سے بیان کرواتی ہیں۔

''میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہیں جانتی کاکا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اورمسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔'' ۶۸

چونکہ اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے تقسیم بنگال کو موضوع بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بنگال کی تقسیم ہوئی مگر ایک بات جو اس ناول میں موجود ہے وہ ہے قومی یکجہتی آپسی بھائی چارے کی عناصر جو اس ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' میں بھی موجود ہے۔

گردش رنگِ چمن

''گردشِ رنگِ چمن'' قرۃ العین حیدر کا بہت ہی اہم ناول ہے جو ۱۹۸۷ء میں مکتبہ دانیال، کراچی سے شائع ہوا۔ اس ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' کے بارے میں پروفیسر

عبدالمغنی یوں رقمطراز ہیں:۔

''مصنفہ کا تازہ ترین ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' بھی ایساہی ایک مطالعہ ہے جس کے اختتامیہ میں اس کو ''نیم دستاوزی ناول'' کہا گیاہے۔ یہ دستاویز ان اشخاص اور خاندانوں کے احوال کی ہے جن کی جڑیں قدیم جاگیردرانہ میں ہیں اور شاخیں اپنے برگ وبار کے ساتھ جدید تکنیکی اور نیوکلیائی معاشرے میں لہراتی نظر آتی ہیں۔''۴۳؎

گردش رنگِ چمن کی ابتدا مرکزی کردار مسز عندلیب بیگ اس کی بیٹی عنبرین بیگ اور ڈاکٹر منصور کاشغری کی گفتگو سے ہوتی ہے۔ بات چیت کا انداز کافی بے تکلّفانہ ہے۔ ناول کی کہانی ۱۸۵۷ء اس کے آس پاس سے لئے کر ہندوستان کی آزادی کے بعد تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کہانی کے اہم کرداروں میں دلنواز بیگم، مہر وبیگم، بیگم گل رخ بانو عرف نواب فاطمہ (متوسط طبقے کے شریف مسلمانوں کی بیٹی جو اپنے والد کی وفات کے بعد دربدر ہوئی اور آخرکار طوائف بننے پر مجبور ہوئی) قابل ذکر ہیں۔ان کرداروں کے علاوہ نگار خانم اور شہوار خانم دو بہنوں کے ضمنی کردار ہیں جو متوسط طبقے کی عکاسی کرتے ہیں۔ نگار خانم کا کردار ایسا کردار ہے جو اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے اور نہ کہتے ہوئے بھی بہت سی باتیں پڑھنے والوں کے ذہن میں لاتا ہے۔ دوسری جانب شہوار خانم ہوائے قطعے بناتی ہے۔ نگار خانم ڈاکٹر منصور کاشغری کے زیر علاج ہے۔

آگے چل کر اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط ہونے

کو لے کر سرسری تبصرہ کیا ہے۔مغل حکمرانوں کی نا اہلی اور غلام ملک کے تباہ کن حالات ، اور برسوں کی مٹتی ہوئی تہذیب کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ بالخصوص نوابین کی عیش پسندانہ زندگی اورمعاملات متوسط طبقات کی دربدری اورذلت کا قصہ بھی بیان ہوا ہے ۔ آخر کار بعض کردار تائب ہوکر صوفی ازم کو اپنے مذہبی امور کے ساتھ اپنا لیتے ہیں اور مصنفہ ایک لمبے ایسے سے ایک تابناک مستقبل کی خوش کوں امید کی جانب مراجعت کر جاتی ہیں۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے اس ناول ''گردش رنگِ چمن'' کے موضوع کا تعلق ہے توانہوں نے اس ناول میں اشرافیہ طبقات کی بیگمات ان کے حالات کو اس ناول کا موضوع بنایا۔جن مسائل اور حالات سے غلام ہندوستان گذشتہ ڈیڑھ دوصدی سے جوجھ رہاتھا بادشاہت کازوال اورنوابین کے درباروں کے اجڑنے کے سبب ان کی بیگمات اورشہزادیایوں کو حالات نے طوائف بنا دیا ۔ اس تمام ذلت کی وجہ مصنفہ نے مغل شہنشاہوں کی نااہلی اورعیش پرستی کوقر ار دیا ہے ۔ میں اپنے موضوع پر آتا ہوں کہ ان موضوعات اور حالات کے باوجود ،رواداری قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے مسائل قرۃ العین حیدر کی تخلیق ،گردش رنگ چمن ، میں وقت کی ضرورت کے طور پر مصنفہ نے کہیں طنزیہ پیرائے میں اور کہیں قومی اور انسانی ضرورتوں کی وجوہ کے طور پر نہایت فنکاری کے ساتھ لبھانے کی کوشش کی ہے ۔ جتنا بڑا فنکار ہوتاہے اتنے ہی اپنے فنی درجے کے مطابق ان ذیلی مسائل کو اپنی تخلیقات میں جذب کرلیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں بھی ان مسائل کی موجودگی نہ تو ترقی پسندوں کی طرح

نمایاں طور پر ہے اور نہ ہی جدیدیت کی روش کی تقلید ہے بلکہ مصنفہ نے ان مسائل کو اپنی ایسی فطری زبان میں برتا ہے۔ ایک جگہ قرۃ العین حیدر مسلمانوں کے فرضوں کو طنزیہ پیرائے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی ضرورت پر فنکارانہ طور پر کرداروں کی زبانی یوں زور دیتی ہیں:۔

''تم ڈاکٹر نہ بنتے تو کیا بنتے ؟''

''ابا زندہ رہ گئے ہوتے تو مولوی ، باقاعدہ ندوی یا دیوبندی مولانا۔مگر وہ کیا ہے ۔خارا پیشہ آزر تراشی۔''[۴۴]

ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:۔

''منصور تم کافی اینٹی مسلم بھی ہو'' عنبر نے کافی بناتے ہوئے اظہار خیال کیا۔''میں نے اب تک جو کچھ کہا اس میں کوئی پوائنٹ غلط ثابت کرو ۔کرو غلط ثابت !حق بات کہتا ہوں۔ سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے ۔کیا تم خود ہی پرسوں نہیں کہہ رہی تھیں شیعہ سنی فسادوں میں دونوں فریق ہندو منسٹروں کے پاس ایک دوسرے کی شکایتیں لیکر جاتے ہیں ان سے فیصلے کی درخواست کرتے ہیں ۔ کتنی شرمناک صورت حال ہے ۔ بنارس میں شیعہ فریق دوسنی قبروں کا معاملہ سپریم کورٹ تک لے گئے ہیں ۔قبریں اس جگہ سے اکھاڑ نے کا معاملہ ہے ۔[۴۵]

اس ناول میں اس طرف سے اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں مختلف عقیدہ کے لوگ ہوتے ہیں اورانسانوں میں مختلف مذاہب ہوتے ہوئے آزاد ہند سے پہلے یا انگریزوں کی آمد سے پہلے مساوات اور جھگڑے نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی دواہم جماعتیں ہوا کرتی تھیں ایک سنی اوردوسری شیعہ اوران دونوں کے درمیان کبھی فساد نہیں ہوتا تھا بلکہ دونوں مل کرمحرم کا تعزیہ اٹھایا کرتے تھے اور حدتو یہ تھی کہ غیر مسلم بھی ان تہواروں اور جلسوں میں بڑی عقیدت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ یہ فسادات کی آگ سیاسی لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے آس پاس پیدا کی ہیں آپسی بھائی چارے اورقومی یکجہتی اور رواداری کی چند مثالیں گردش رنگ چمن سے ملاحظہ ہوں:۔

''اچانک ندی اورآسمان آتش بازی سے چمک اٹھے۔

''آج شبِ برات تونہیں ہے؟''منصور نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں تو ۔ یہ گورمنٹ نے لکھنؤ فیسٹول کیلئے شاہی کی جل بہار اور بسنت کا میلہ دی وائیو کیا ہے ۔آتش بازی ،کنکورے بازی اورتیرا کی مقابلے'' آہا۔ میں تو لکھنؤ بہت برسوں کے بعدآیا ہوں۔ یہاں ایک مذہبی جل بہار کی رسم بھی قدیم سے چلی آتی ہے ۔گومتی کی کشتیوں پرآتشبازی شب برات کی شام لوگ باگ سجے ہوئے بجروں پر بیٹھ کر بارہواں امام کے نام عریضے گومتی میں بہادیتے ہیں ۔کورے کاغذ پرزعفران سے لکھ کر۔''۴۶

ایسا ہی رہاہوگا بھیا۔ ہمارے ابابتلاتے تھے ۔حضور پہلے شیعہ

اور سنت جمات دونوں کے تعزیے ایک ساتھ تال کٹورہ پھول کٹورہ کی کربلاؤں میں جاتے تھے۔ بڑے بھیا سے پہلے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے ایک بڑے مولانا صاحب نے فرمایا سنی ڈھول تاشے بجاتے ہمارے ان کربلاؤں میں آتے ہیں ہماری سوگواری میں فرق پڑتا ہے۔''

''جی بھیا۔ تو سنت جماعت اپنے تعزیے ماہ نگر لے جانے لگے۔ پھر وہ چار یاری جھنڈا کھڑا ہوا۔''۴۷

''اودھ کے اکثر دیہات میں سنی عوام جم کے ماتم کرتے تھے۔ جی ہاں بھیا۔ اور ہمارے دیہات میں ہندو عورتیں روتی ہیں اور انڈیا بھر میں سنت جماعت کے تعزیے سب سے زیادہ شاندار سبیلیں، پٹے باڑی، خلیفاؤں کے اکھاڑے۔''۴۸

یہاں ہمارے ملک میں شیعہ سنی کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں اگر ہم ڈیڑھ دوصدی پہلے کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو دیکھیں تو ہندوستان میں تو دونوں جماعتیں ایک ہی مدرسے میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور اسی کی طرف قرۃ العین حیدر نے اشارہ کیا ہے:۔

''فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ.....'' نواب صاحب نے پھر بات کی۔
''شہنشاہ اورنگ زیب نے قائم کیا تھا اور اس میں ہمارے زمانے تک شیعہ سنی طالب علم ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ریاستوں

کے خاتمے تک شیعہ والہان ریاست سے گرانٹ دیا کئے۔''۴۹؎

ایک اور جگہ قرۃ العین حیدر نے شیعہ، سنی اور ہندوؤں کے مل کر تعزیے کی واقعہ نگاری اور منظر نگاری کو اس فنکارانہ انداز بھی ڈھالتی ہیں کہ رواداری اور بھائی چارگی کے اس واقعے سے قدیم ہندوستان کے حسن پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے اور ایسی مثالوں کو آج کے فرقہ وارانہ پراگندہ ماحول میں سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

> ''دھوبن چڑیا قریب آ بیٹھی'' سنیوں کے تعزیے۔ درگاہوں اور ضریحوں کے سامنے ہندوؤں کی بھیڑ۔ ماشاء اللہ۔ لیکن اس خوش گوار رقت خیز منظر نامے کے باوجود کسی ایک قسم کا فرقہ وارانہ فساد آج تک رکا ہے۔''۵۰؎

قرۃ العین حیدر فسادات اور واردات کو آزادی کے آس پاس اور اس کے بعد کا زمانہ بتاتی ہیں کہ آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں اور خصوصاً لکھنؤ میں اس قسم کے فسادات نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن ان فسادات کی وارداتوں کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ مصنفہ کے دل میں کرب بھی ہے یہ سب فسادات برپا ہونے پر ذرا درجہ ذیل پیراگراف دیکھیں:۔

> ''بیٹا لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد سینتالیس تک میں تو ہوا نہیں اور دوسری بات یہ کہ پیپل سرکار نے خود کاٹا تھا۔ اب سندھی پنجابی، شرنارتھیوں کی اولاد کبوتر بیچتی ہے۔ ان کا لب ولہجہ لکھنؤی ہو چکا ہے مگر وہ پرانا ماحول ختم ہو گیا۔ اور بھیا یہ ابھی سات آٹھ

سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب تاریخی عمارتیں گرائی جارہی تھیں
ہمارے شیعہ سنی اپنے بھیانک فسادوں میں جٹے ہوئے تھے ۔
مہینوں کرفیو لگا رہتا ۔شیعہ سنی اپنی پالی ٹکس لڑاتے یا لکھنؤ بچانے
کی کوشش کرتے ۔اتنی فرصت کہاں تھی؟''۵۱؎

اسے رواداری ،قومی یکجہتی کہئے یا ہندوستان کا کربناک المیہ، کہ بعض ایسے مقامات بھی
ہندوستان میں آتے ہیں جہاں ہندو مسلم اورعیسائی وغیرہ مل کر میلا سانجھا کرتے ہیں۔
عہدے داروں صاحب اقتدار اور آزاد مشن کے لئے تو یہ رواداری یا خوشی کا موقعہ
ہوسکتا ہے لیکن یہ ان مغل زادیوں اور نوابین کی بیگمات کے لئے قیامت کا ہنگامہ ہے
جہاں انہیں ایک طوائف کے روپ میں گھنگھر واور پازیب باندھ کرعہدداروں کے سامنے
رقص کرنا پڑتا تھا۔جن ہاتھوں میں منہدی اور پھولوی کی سیج ہوا کرتی تھی ان کے پاؤں او
ر ہاتھ رقص کے زیورات کے سبب زخم خوردہ تھے اوعزت کی جگ ہنسائی۔ دونوں طرح
کے رجحانات کومندرجہ ذیل اقتباسات میں دیکھا جاسکتا ہے :۔

''ہمارے ایک دوست کا ارشاد ہے کہ اہل فرانس جب
نگارستان لکھنؤ میں محافل رقص وسرور برپا کرتے تھے تو خوشدلی سے
اپنے ٹوپ مجرے والیوں کے سروں پر رکھ دیتے کبھی ٹھمکی لگا کر وہ
بانکی ٹوپیاں ادبار نشاط خور اوڑھ لیتیں۔اس طرح وہ کار چوب سے
سج کر انکی پوشاک میں شامل ہوگئیں''۵۲؎

''جابجا پنڈالوں کے نیچے بھگت باز ، قوال، دھاڑی بچے اور بھانڈ لوگوں کو محفوظ

کر رہے تھے ۔ رات کو شہنائی نوازوں کی روشن چوکیاں گشت کرتیں۔تخت رواں پر کھڑی عطر بائیں ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشد'' گاتی پھریں ۔ شادی کا جشن سات دن تک جاری رہا۔آخر روز صبح منہ اندھیرے حسب دستور بھیرویں پہ ختم ہوا۔

مہرو میں رئیسوں کی شادیوں میں کھڑے ہوکر مبارک بادیاں گاتے گاتے تھک گئی ہوں اسی لئے میں نے ''ہاں'' کردی۔

دربار ہال میں سنگھاسن کے سامنے کھڑی جی دلنواز اوران کے ساتھ والیاں بھیرویں الاپ رہی ہیں۔ پیا اون کی بھئی بیر یا دروجوٹھاڑی ہوں۔ پیا کربلائے معلیٰ کے گورستان پہنچ گئے ۔

عشق بازی میں کرامات نہ ہوکیا معنی جس کو دل چاہے   ملاقات نہ ہوکیا معنی دروجو ٹھاری ہوں کرامت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا تھا۔ دروجو ٹھاری ہوں............قرمزی رنگ کی بنارسی ساڑی ۔ مہاراج دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ۔ کام کنڈالا ۔خطاب عنایت کیا۔سمراٹ بکرماجیت کی راج نرتکی کام کنڈلا۔''۵۳؎

قرۃ العین حیدر نے اس ناول ''گردش رنگ چمن'' میں بتایاہے۔کہ ہندوستان پہلے غلام تھا اوراس غلامی سے نجات پانے کے لئے یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کا نمایاں رول رہاہے۔ یہاں مختلف قومیں تھی مختلف مذاہب کے لوگ یہاں رہتے تھے مگر آزادی کی خاطر قومیں اورتمام مذاہب کے لوگ ایک ہوئے ۔ ان سب سے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی نشستوں کی جھلکیاں ''گردشِ رنگ چمن'' میں دیکھی جاسکتی ہیں جو بعد میں ہندوستانی آزادی کا سبب اور بنیاد بنیں۔جس کو حیدر یوں رقمطراز ہیں:۔

''دیوبندی مولانا لوگ کانگریس کے ساتھ تھے۔''حسین بخش بولا کیئے۔ ''دیوبندی اور فرنگی محلی'' منصور نے جذبے سے کہا۔''ایک بار مولان آزاد نے گاندھی جی سے فرمایا تھا یہ بوریہ نشیں علماء جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں مسلمانوں میں ان سے انقلابی جماعت اور کوئی نہیں۔''

امیر احمد خان راجہ محمود آباد اور راجہ صاحب مسلم لیگ نے دونوں بڑے لیڈر شیعہ مگر لیگ میں حضور شیعہ سنی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ سب مسلمان ایک ۔ پھر ایک سنی لیڈر کانگریس سے لیگ میں آ گئے اور ایک شیعہ لیڈر لیگ سے کانگریس میں گئے ۔۵۴

قومی یکجہتی آپسی بھائی چارے اور روا داری کی ایک صورت طبقہ اشرافیہ کے یہاں ہر مذہب وفرقہ کے افراد کی آمد بھی ہے جہاں ان کی خندہ پیشانی کے ساتھ مہمان نوازی کی جاتی تھی لیکن ان میں رواداری سے زیادہ عیش وطرب کی روشنی شامل ہے۔ جہاں ہندو کے گھروں میں مسلمان نوابین اور مسلمانوں کے گھروں میں ہندو راجاؤں کی محفلیں سجتی تھیں اور ایک دوسرے کی خاطر کی جاتی اور بڑے جوش خروش سے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی تبادلہ خیالات ہوتے جس کی مثال قرۃ العین حیدر نے یوں پیش کی ہے:

''حضور نواب کلب علی خان بہادر رام اقبالہ کے مہمانانِ گرامی میں مہاراجہ ہولکراف اندور، مہاراجہ ڈگ بجے سگھ آف بلرام پور (اودھ) اور ہز ہائی نس نواب صاحب سہراب نگر رامپور میں ہنوز

تشریف فرما ہیں۔"۵۵؎

قرۃالعین حیدر نے بتایا ہے کہ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کا یہ حال ہے کہ یہاں کے صوفی سنت اور سادھو اور تہوار سب کچھ مشترکہ ہیں۔ کوئی تہوار ایسا نہیں جو اکیلے ہندو یا مسلمان مناتے ہیں بلکہ مل جل کر مناتے ہیں یہاں صوفی سنت مشترکہ ہیں۔ جتنی قدر وعزت مسلمان اپنے علماؤں اور صوفیوں کی کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہندو اُن کی قدر کرتے ہیں جن کی مثال قرۃ العین حیدر نے کنور صاحب کے ذریعے کچھ اس طرح سے پیش کی ہے:۔

> "ہرطرف لوکل کلر کی افراط۔ دیوے شریف سے نکلے۔ اب ذرا اکتا کر کنور سے پوچھا"تمہارے پیر صاحب کسی جنگل بیابان میں رہتے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔ گویا اپنے پیر کا بلا وجہ سرسری تذکرہ کرنا بے ادبی تھی۔ شاہراہ چھوڑ کر ایک کچی سڑک پر کار موڑی۔

"تم کو راجہ صاحب محمود آباد یاد ہیں؟ راجہ امیر احمد خان مرحوم" چند منٹ بعد ہچکولے کھانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"ہاں ایک زمانے میں جب ان پر مذہب انتہا سے زیادہ طاری ہوگیا تھا انہوں نے طے کیا کہ باری باری پیغمبر کے طرز حیات کی پیروی کریں گے۔"

ہمیشہ جو کی روٹی کھاتے تھے راجہ صاحب۔ سادھو سنت آدمی تھے"۵۶؎

دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''شادی بیاہ عید ،بقرعید موسمی پرندوں کی مانند نمودار ہوکر
> چڑیوں کا صدقہ اتارنے والی ہندو چڑیمار عورتیں، بسنت پنچمی پر
> گیہوں کی تازہ بالیاں سنبھالے ہمیشہ دلبر سبحان الا پتی میراثین۔
> نویں محرم کو دوہے روتی بنجارنیں۔ اس صعبائی تمدن کو بھی سیاست
> اور ٹیلی ویژن عنقریب ہڑپ کر جائے گا'' ۵۷

قرۃ العین حیدر نے جہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو پیش کیا ہے وہی ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ مشترکہ کلچر آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گا جس کی وجہ سے ہمارے ملک کی پہچان ہے ۔ان سب باتوں کو قرۃ العین حیدر نے اس ناول گردش رنگ چمن میں پیش کیا ہے۔

چاندنی بیگم

چاندنی بیگم قرۃ العین حیدر کا بہت مشہور ناول ہے جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔قرۃ العین حیدر کے پہلے ناولوں کی طرح اس ناول کا بھی بنیادی موضوع تقسیم ہند اور اس سے پیدارشدہ حالات ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار''چاندنی بیگم'' ہے اور اسی مناسبت سے اس ناول کا نام بھی قرۃ العین حیدر نے ''چاندنی بیگم''رکھا ۔قرۃ العین حیدر نے اس ناول کو۱۴؍ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔گل سرخ کے عنوان کے تحت ناول کی شروعات ہوتی ہے۔شروع میں اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ایک حویلی کا تعارف کروایاہے تہذیب وثقافت اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مظہرہے ۔ ناول کا ہیرو قنبر علی ہے جو

احتجاجی ذہن رکھتا ہے اور نچلے طبقے کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ اس پورے ناول میں قرۃ العین حیدر نے نچلے طبقے کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کسی حد تک ناکام بھی ہوئی ہیں چونکہ قرۃ العین حیدر ہمیشہ ہی سے اعلیٰ طبقے کی نمائندہ رہی ہیں۔ ان کی زبان ان کے کردار سب ہمیشہ اعلیٰ سوسائٹی کی نمائندگی کرتے ہیں اوراس ناول ''چاندنی بیگم'' میں قرۃ العین حیدر نے کوشش تو ضرور کی کہ وہ نچلے طبقے کی بھی عکاسی کریں مگر وہ کسی حد تک ناکام ہی رہیں۔

اس ناول کا آغاز ہندوستان کے برطانوی نوآبادیاتی عہد سے شروع ہوتا ہے ۔ شیخ اظہر علی ایک نامی گرامی وکیل ہیں ان کا امیر بیٹا قنبر علی جو بہت ذہین ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بہت تناثر ہے اوراشترا کی خیالات رکھتا ہے۔ اس کی ماں ایک حسن سلوک عورت ہے قنبر علی کی شادی چاندنی بیگم سے طے ہوتی ہے۔اس کے بعد قنبر علی کی ماں کی وفات ہوجاتی ہے ۔مراثیوں کے ایک طائفے کو قنبر علی کے حالات وخیالات کی خبر ہوئی تو انہوں نے قنبر علی کو اپنے تحت کرلیا اور ایک مراثن بیلا رانی سے اس کی شادی کروا دی گئی ۔ بیلا نے قنبر علی کی کوٹھی کا نقشہ بدل دیا اور پوری طرح قنبر علی پر حاوی ہوگئی۔ اسی دوران چاندنی بیگم کے والدین کا انتقال ہوگیا اور وہ بے سہارا ہوکر قنبر علی کے پاس آئی۔ یہاں چاندنی بیگم کو کوئی خاص عزت نہیں ملی اور نہ ہی بیلا رانی نے چاندنی بیگم کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا ۔ اسی دوران ایک دن ریڈ روز کوٹھی میں لاشعوری طور پر چاندنی بیگم کے ہاتھوں آگ لگی اور قنبر علی کے اہل خانہ کیساتھ وہ بھی جل کر راکھ ہوگئی۔

اس طرح کونونیل عہد کی دونسلیں ختم ہوگئیں۔ جو برطانوی عہد سے چلی آرہی تھی۔

قرۃالعین حیدر کے اس ناول چاندنی بیگم میں طنز و مزاح کا عنصر بہت نمایاں ہے ۔جس کو جابجا اس ناول میں دیکھا جاسکتا ہے پروفیسر عبدالحئ، قرۃ العین حیدر کے اس ناول چاندنی بیگم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''چاندنی بیگم میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے لیکن یہ ظرافت کی وہ چاندنی نہیں ہے جو ذہن کے افق کو روشن کرتی ہے ۔ بلکہ ہجو ملیح کا وہ کہرایا کہا سا ہے جس سے مطلع حیات تاریک ہوتا نظر آتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی سنگینی اور واقعات کے بے رحمی نے ناول نگار کو چین بہ جبیں اور نکتہ چیں بنا رہا ہے ۔مگر اس کی شائستگی اور خوش طبعی اسے کسی کی کھلی مذمت اور تمسخر سے روکتی ہے ۔لہٰذا وہ صرف پر مذاق تبصروں پر اکتفا کرتی ہے ۔''٦٩

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے اس ناول ''چاندنی بیگم'' میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کا تعلق ہے تو ''چاندنی بیگم'' میں یہ بات بہت حد تک عیاں ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں اسی موضوع کو ''چاندنی بیگم'' کا عنوان دے کر جابجا ان عناصر کی ترجمانی کی ہے ۔قرۃ العین حیدر کے اگر ہم اس ناول چاندنی بیگم کے ابواب پر غور کریں تو انہوں نے اس ناول کے ابواب کے نام بھی مشترکہ رکھے ہیں مثلاً مدھومالتی، کادمبری، کجلی بن، بوہمین گرل، آلیا اوول، ٹیپو سلطان، بنت الجبل وغیرہ ۔ان ناموں سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں قرۃ العین حیدر نے ٹیپو سلطان اور بنت الجبل اپنے ابواب کے نام رکھے وہاں اگر وہ چاہتی تو اور بھی کئی مسلم نام رکھ سکتی تھی مگر ایسا انہوں نے نہیں کیا اور کچھ ابواب

کے نام ہندو مثلاً مدّھو مالنی، کا دمبری وغیرہ رکھ کر قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارگی اور مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھایا ہے ۔قرۃ العین حیدر نے اپنی شروعاتی تخلیقات سے لیکر آخری تحریرتک مشترکہ تہذیب کی بات کی ہے ۔ وہ ہمیشہ سے تقسیم کے خلاف رہی ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کوایک مانتی رہی ہیں ۔ جہاں وہ تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئی اور وہاں بھی جب انہوں نے لکھا تو ان کی ان تحریروں میں بھی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کےعناصر نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔قرۃ العین حیدر ''چاندنی بیگم'' کے شروعات میں جب گل سرخ ابواب میں پھولوں کا ذکر کرتی ہیں تواس میں طرح طرح کے پھولوں کا ذکر کرتی ہیں یہ یہی پھول ہیں جن سے مشترکہ تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے جس کو کچھ اس طرح سے بیان کیا گیاہے:۔

> ''ندی کنارے نشیبی زمین کا وہ وسیع قطعہ اب رنگا رنگ پھولوں سے پٹ گیا ہے ۔گل عباس ،گل جعفر ،گل ہزارہ ،گل صد برگ، گلہائے آفتاب ومہتاب ۔ بنجارے یہاں پڑاؤ کرتے ہیں اور جمّا دھوبی کپڑے سکھاتا ہے اپنے گدھوں کو پھولوں میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتاہے اور ارہر کی کاشت بھی کرتاہے ،کبھی کبھار کوئی زنگ آلود شئے ہل کی نوک سے ٹکرا جاتی ہے۔ وہ اسے اُٹھاکر غور سے دیکھتاہے اور مایوسی کے ساتھ دور پھینک دیتا ہے بھربھری مٹی کے اندر کیچوے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ساری عمراپنے کام میں مصروف ، خیر کیچوؤں کی کیاعمر اور کیا زندگی مگر وہ اپنے گھر

بنانے میں جٹے ہوئے ہیں اور گیلی مٹی کی ننھی ننھی دھریاں بناتے
رہتے ہیں ۔ ایک طرف گوالوں اور گھوسیوں نے سبزیاں اُگالی ہیں
بہت ہی ذرخیز مٹی ہے جس فصل میں جو چاہیئے بوییئے ۔ اُگاییئے
۔"۸

قرۃ العین حیدر نے یہاں کی مٹی کی خاصیت بھی بتاتی ہے کہ یہاں کی مٹی بہت ذرخیز ہے۔ کیا قرۃ العین حیدر کی مراد ہندوستان کی مٹی ہے؟ جو بہت ذرخیز ہے ۔ جس میں ہر تہذیب ہر مذہب ہر قوم کے لوگ آ کر بسے اور آباد ہوئے پھلے پھولے اس مٹی نے ہر تہذیب اور قوم مذہب کو اپنے اندر جذب کیا اور ایک مشترکہ تہذیب کی تشکیل کی جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں ملتے ہیں۔ یہاں کے راجاؤں اور نوابوں نے بھی اس دھرتی اور اس مٹی میں پیدا ہونے والے کی عزت اور حوصلہ افزائی کی ہے ۔ اس ناول میں بیرسٹر اظہر علی جو ایک نامور وکیل ہیں ان کے گھر میں تمام طرح کے لوگ آتے ہیں اور ان کی مہمان نوازی یہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں جس کو قرۃ العین حیدر یوں بیان کرتی ہیں:۔

''لبِ دریا کوٹھی کی چہل پہل میں ارباب چمن شامل تھے ۔
طوطے، مینائیں، کوئلیں، لال سرے، بیٹر اظہر علی نامور قانون دان
۔ بٹو باجی مقبول سماجی کارکن ۔قنبر علی طلبا کے نیتا ۔صبح سے شام تک
بھانت بھانت کی خلقت کا تانتا بندھا رہتا۔ پہلے تعلقہ داران
گرامی اپنے لامتناہی مقدموں کے سلسلے میں طویل موٹروں سے

برسانی میں اترتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے قربہ متبنٰی بیٹے جوعموماً
''بے بی'' کہلاتے تھے۔ بگھیوں پر سوار ریشمی کرتے اورجھاگ
ایسی جھک سفید دھوتیوں میں ملبوس ہیرے چمچاتے وادر ہوتے
۔اے

آگے دوسری جگہ قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:۔

''جو بے دخل کسان متروکہ قرار دیئے جانے والے کھیتوں کے
سلسلے میں فریاد لے کر آتے اظہرعلی بلامعاوضہ ان کی قانونی امداد
کرتے اور بیچارے اکثر بطور نذرانہ ان کے لئے ڈلیامیں تازہ
سبزی یا گُڑ کی پھلیاں لے آتے اورانتظار میں صبر سے آم کے
درختوں کے نیچے بیٹھے رہتے۔نماز کا وقت آتا باغ کے گوشے میں
استارہ مختصر نیم شکستہ مسجد میں جاکر نماز پڑھ آتے اوربھرانتظارمیں
مصروف ہوجاتے۔۲ے

اظہرعلی بلا معاوضہ ہی لوگوں کی مدد کرتے یہ بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی علامت ہے کہ جس کے پاس پیسے نہ ہوں اُس کی مدد کی جائے اورجن کسانوں کے پاس پیسے نہ ہوتے وہ بھی وکیل صاحب کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے مثلاً سبزیاں اورگڑ کی پھلیاں وغیرہ اسی طرح وکیل صاحب کے باغ کے ایک حصے میں جہاں مسجد ہے وہی دوسری طرف دوسرے کونے میں منشی بھوانی شنکر وغیرہ نے پوجا کے لئے ایک جگہ منتخب کی ہوتی ہے جہاں وہ پوجا کرتے ہیں جس کو حیدر یوں تحریر کرتی ہیں:۔

''باغ کے دوسرے گوشے میں ندی کے رُخ پیپل کا بوڑھا
درخت تھا۔ اس کی جڑ میں کسی زمانے میں کسی نے ندی سے نکال
کر ایک سیاہ گول پتھر نصب کردیا تھا۔ گردا گرد لکھوری اینٹوں کا
چبوترہ ....منشی بھوانی شنکر۔ بھگوان دین اور پھٹکو وہاں پوجا پاٹ
کرتے۔''۳۷

ہمارے ہاں سماج میں پرانی تہذیب و کلچر کو بہتر اور معتبر سمجھا جاتا ہے ۔اس کو قائم رکھنا ہمارا فرض ہے کیونکہ ہماری پہچان اسی تہذیب اور کلچر سے ہے آج جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے ہر طرف انگریزی کا بول بالا ہے اس دور میں بھی یہاں ہندی اور اردو اور دوسرے مقامی زبانوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔آج جہاں ہر طرف مغربی طرز کے اسکول قائم ہورہے ہیں قرۃ العین حیدر اگر چہ ان ہی اسکولوں میں پڑھی مغرب میں خود بھی گئیں اور وہاں کی تہذیب کو اپنایا بھی مگر اس تہذیب میں انہیں اپنا وہ سب کچھ محسوس نہیں ہوا ان کا دل خالص ہندوستانی تھا۔ جہاں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب مل جل کر رہتے اور مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے پاسبان تھے ۔قرۃ العین حیدر سے اپنی تعلیم اور ہندوستانی طرز کی تعلیم سے گہرا لگاؤ تھا ایک جگہ بیگم بدر النساء جو اظہر علی کی بیوی ہیں اس کردار کے ذریعے یوں مغربی تقلید کر طنز کرتیں ہیں:۔

'' بیگم بدر النساء اظہر علی کو نئے ہندوستان میں جہالت
اور بیوقوفی اور احمقانہ مغرب پرستی کے اس سیلاب نے از حد دیگر
کر رکھا تھا۔ ایک شام رانی صاحبہ سے ملنے انہیں تو برساتی پر اسکول

کا بورڈ لگا دیکھا اندر گئیں۔ صفیہ کو اڑھے ہاتھوں لیا۔ غضب خدا کا بیٹا تم تو خود سینٹ ایگسیز کی تعلیم یافتہ ہو۔ اتنی جاہل ہوگئیں۔ کیا تم کیتھولک نن بن گئی ہو اور یہ خانقاہ قائم کی ہے۔ پوپ آف روم سے اجازت لے کر؟ آخر یہ تم سب کو ہوا کیا ہے۔ دھڑا دھڑ یہ بوگس کانونٹ کھل رہے ہیں۔''[۴۷]

بیگم بدر النساء کو اپنی تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کتنا عزیز تھا یہ سب ان سطور کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے ان کو خوف ہے کہ مغربی طرز کے اسکول کھلنے سے یہاں کی تہذیب پر اثر پڑے گا جس کو وہ برداشت نہیں کرسکتی ۔ بڑوباجی بھی ایک کردار ہے جو سماج کو سدھارنے اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے قائم کرنے کی غرض سے گروہ تیار کیا ہے۔ وہ تہذیبی کارروائیاں کرتی رہتی ۔لیکن آہستہ آہستہ وہ سب ختم ہوجارہا ہے ۔ وہ نیک عورتیں جب عمر دراز ہوگئیں اور ان کی اولاد آدرش کے بجائے مصلحت اور مصالحت پر عمل پیرا ہوئی۔ سیندور اور منگل سوتر پہنا اب یہاں کی عورتوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ یہ سب اب پہنا نہیں چاہتی اور کچھ لوگ تو اسے غلامی کی نشانی بتاتے ہیں دقیانوسیت کا سمبل مگر بڑو بیگم ان سب کو سہاگنوں کے لئے بہت بڑی اہمیت مانتی ہیں اور یہی یہاں کی قومی یک جہتی ہے کہ یہاں دوسرے مذہب کے لوگ مثلاً مسلمان اور عیسائی جو یہ سیندور اور منگل سوتر نہیں پہنتے وہ بھی اس کا احترام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ منگل سوتر اور سیندور سہاگن کی نشانیاں ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ایک اور مثال قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی آگے بتاتی ہے

جہاں اظہر علی کی وفات ہوجاتی ہے تو بھوانی شنکر کو ان کے پریوار کی کتنی فکر ہوتی ہے کہ ان کے گھر کا اب کیا ہوگا قرۃ العین حیدر اس بات کو یوں رقمطراز ہیں:۔

''بھوانی شنکر سر جھکائے کنویں کے منڈیر پر بیٹھے تھے بیگم صاحبہ دلہن بن کر اس گھر میں آئیں تھیں وہ خود لڑکے سے تھے ان کی بھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اپنی چھم چھم کرتی دلہن کو گاؤں سے یکے پر بٹھا کر سلام کروانے لائے تھے۔ چالیس سال تک انہوں نے بیرسٹر صاحب کے دفتر میں منشی گیری کی۔ چالیس سال اپنی مسئلوں اور موکلوں کے معیت میں گذارے قنبر میاں کو گود میں کھلایا۔ کندھے پر بٹھا کر سکندر باغ کی سیر کروائی۔ اسکول پہنچانے گئے ان کے ماں باپ کی طرح ان کی ہر ضد پوری کی۔ ماں نے تو لاڈ پیار میں ان کا کباڑا کر دیا تھا۔ منشی جی نے بھی کسر نہیں چھوڑی تھی اب ماں کے مرنے کے بعد یہ دنیا کا مقابلہ کر پاویں گے۔ میگزین کے ایڈیٹری کرنا اور بات ہے۔''۵ے

قرۃ العین حیدر نے بتایا ہے کہ بھوانی شنکر ہندو ہو کر کس طرح قنبر علی کی پرورش کرتا ہے یہاں یہ ہمارے ہندوستانی تہذیب و کلچر کی ہی دین ہے کہ یہ سب باتیں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کو قائم رکھتی ہیں اور یہی باتیں قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں برتی ہیں۔ یہاں ہمارے ملک میں یہودی بھی رہتے ہیں ہندو بھی مسلم بھی، اس بات کی عکاسی بھی قرۃ

العین حیدر نے منظر کشی کے ذریعے یوں بیان کی ہے:۔

''قنبر صاحب ہمارے محلے میں بہت سے یہودی رہتے تھے ۔مراٹھی بولنے والے بنی اسرائیل پڑھے لکھے تھے وکیل اور ڈاکٹر۔ بغدادی ، یہودی گھر میں عربی بولتے تھے زیادہ تر غریب ۔ پرانے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے ۔شام پڑھے وہ نکڑ پر مغل دلپٹوداں کے سامنے بینچ پر بیٹھ جاتے۔موٹا لدھڑ ساایرانی ان کو چائے کے گلاس بھیجوا تا رہتا۔ وہ تربوز کھا کراس کے چھلکے کچرے کے ڈھیر پر پھینکا کرتے ۔ رفتہ رفتہ وہ سب اسرائیل چلے گئے۔ داؤد نصر اللہ ٹیکسی ڈرائیور ہماری چال میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام روزا تھا ۔لڑکی دبیکا۔ بوڑھی ماں حنّہ۔نصر اللہ داؤد بھائی کہلاتا تھا۔ بہت نیک دل آدمی تھا۔ اماں جب بیمار پڑیں ہمارا کڑکی کا زمانہ تھا۔ وہ اماں کو بلا کرا یہ لئے ہسپتال لے جاتا رہا۔ اس کا لڑکا اسرائیل جاچکا تھا وہاں فوج میں سولجر بھرتی ہوگیا تھا۔ ۔ روزانے اس کی تصویر دیوار پر لگائی جس میں وہ وردی پہنے بندوق تانے کھڑا تھا۔ وہ تصویر دیکھنے کے بعد گلُوّ بھائی نے اماں سے کہا تھا اب داؤد بھائی کی ٹیکسی پر ہرگز مت بیٹھنا اور یہ بیلا کی بچی اگر ان کے ہاں گئی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ ذاتی دوستی اور پاس پڑوس کا لحاظ قومی دشمنی کے سامنے کوئی حقیقت

نہیں رکھتا۔۶ے

قرۃ العین حیدر نے بتایا ہے کہ کس طرح یہاں مراٹھی، ایرانی، مغل، یہودی وغیرہ سب مل جل کر رہتے ہیں کبھی آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرتے ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ایک دوسرے کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بوڑھی حنّہ کو روزانہ نصر اللہ داؤد بھائی اپنے تانگے پر ہسپتال لے جاتا۔قرۃ العین حیدر نے بتایا ہے کہ کس طرح ان لوگوں میں آپسی میل ملاپ اور بھائی چارگی تھی۔قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی بہترین مثالیں قرۃ العین حیدر نے اپنی تمام تخلیقات میں برتی ہیں اور یہاں بھائی چارگی قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملک کی پہچان بھی یہی بھائی چارگی ہے۔مغل باہر سے آئے اور یہاں آ کر انہوں نے حکومت قائم کی۔مگر یہاں کی قومی یکجہتی نے ان کو واپس اپنے ملک میں نہیں جانے دیا۔ یہاں انگریز آئے اور ساڑھے تین سو سال تک حکومت کیں مگر کچھ انگریز یہاں ہی شادی کرکے رس بس گئے ۔ اسی طرح جب اس ناول''چاندنی بیگم'' میں قنبر علی چاندنی بیگم کو اپنے پاس لانے کے لئے جاتا ہے حالانکہ وہ بہت عرصہ کے بعد اس سے ملتا ہے مگر جو اپنائیت ان کی اس پہلی ملاقات میں ہوتی ہے وہ بھی کچھ عجیب ہے:۔

> ''چاندنی قنبر کے ساتھ صحن میں سے گذری۔اسٹوپڈ گرل ۔ وہ بڑبڑائے کیا عجیب بات تھی کہ دونوں میں چھوٹتے ہی اتنی بے ساختہ تکلفی اور دوستی سی ہوگئی جیسے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوں ۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چاندنی نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے

ہوئے سوچا کہ ہمیشہ ان کی رتی رتی بات بڑو خالہ بتایا کرتی تھیں۔
تمہارے کزن کرکٹ کے شوقین ہیں تمہارے کزن بوائے
اسکاؤٹ ہیں۔ حالانکہ یہ میرے سچ مچ کے کزن بھی نہیں تھے ۔
اور اب ایسی اپنائیت سگے رشتے داروں جیسی ، لیکن بیکار ۔ یہ کیسی
بدقسمتی ہے اللہ۔'' ۷۷؎

ہر انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ رشتہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں
میں ایک دوسرے کے لئے اپنائیت ہوتی ہے اس بات کو بھی قرۃ العین حیدر نے قومی یکجہتی
اور آپسی بھائی چارے کی مثال دینے کے لئے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''سنو تو ۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہر شیئے اور ہر ایک واقعہ اندیپنڈنٹ
نہیں ہے، ساری کائنات سے ایک فرد کے ان گنت رشتے ہیں۔
نہ کوئی بیگانہ ہے نہ جداگانہ ۔ اور ہر چیز دوسری چیز پر اثر انداز ہوتی
رہتی ہے ۔ ارے جانے کیا بات ہے'' ۷۸؎

حواشی

نام کتاب مصنف پبلی کیشنز صفحہ

۱ میرے بھی صنم خانے ،قرۃ العین حیدر، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز،۳۶۔۳۷

۲ ایضاً ص ۱۶۰۔۱۶۱

۳ ایضاً ص

۴ ایضاً ص ۲۸۳

۵ ایضاً ص ۴۲۵

۶ ایضاً ص ۵۵۔۵۴

۷ ایضاً ص ۱۲۰

۸ ایضاً ص ۴۰۲

۹ ایضاً ص ۲۰۲

۱۰ ایضاً ص ۲۵

۱۱ ایضاً ص ۱۸۱

۱۲ ایضاً ص ۲۸۲

۱۳ ایضاً ص ۴۵۳

۱۴ ایضاً ص ۳۶۷

۱۵ سفینۂ غم دل قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۰

۱۶ ایضاً ص ۴

۱۷ ایضاً ص ۲۳

۱۸ ایضاً ص ۳۴

۱۹ ایضاً ص ۳۲۰

۲۰ ایضاً ص ۲۱۷

۲۱ ایضاً ص ۲۵۰

۲۲ ایضاً ص ۲۴

۲۳ ایضاً ص ۲۱

۲۴ ایضاً ص ۱۰

۲۵ آگ کا دریا قرۃ العین حیدر لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۲

۲۶ ایضاً، ص ۲۹،۳۰

۲۷ ایضاً، ص ۳۰،۳۱

۲۸ ایضاً، ص ۵۰

۲۹ ایضاً، ص ۸۵

۳۰ ایضاً، ص ۱۸۰،۱۸۱

۳۱ ایضاً، ص ۱۸۱

۳۲ ایضاً، ص ۱۴۲

۳۳ ایضاً، ص ۱۵۰

۳۴ ایضاً، ص ۱۶۱

۳۵ ایضاً، ص ۲۷۲

۳۶؎ ایضاً، ص ۳۴۴

۳۷؎ ایضاً، ص ۵۔۳۴۴

۳۸؎ ایضاً، ص ۳۴۵

۳۹؎ ایضاً، ص ۴۵۰

۴۰؎ ایضاً، ص ۴۶۱

۴۱؎ ایضاً، ص ۵۵۸

۴۲؎ ایضاً، ص ۵۹۲

۴۳؎ قرۃ العین حیدر کا فن پروفیسر عبد المغنی ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۷۵

۴۴؎ گردش رنگ چمن قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹،۱۸

۴۵؎ ایضاً، ص ۹۰

۴۶؎ ایضاً، ص ۱۹

۴۷؎ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳

۴۸؎ ایضاً، ص ۵۸

۴۹؎ ایضاً، ص ۶۰

۵۰ ایضاً، ص ۶۲

۵۱؎ ایضاً، ص ۷۷

۵۲؎ ایضاً، ص ۶۸

۵۳؎ ایضاً، ص ۱۳۲

۵۴؎ ایضاً، ص ۶۰

۵۵؎ ایضاً، ص ۱۱۶

۵۶ ایضاً، ص ۲۴۔۵۲۲

۵۷ ایضاً، ص ۶۰۷

۵۸ آخرِ شب کے ہمسفر قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم مارکیٹ علی گڑھ ۳۱

۵۹ ایضاً، ص ۹۱،۲

۶۰ ایضاً، ص ۱۵

۶۱ ایضاً، ص ۵۰،۵۱

۶۲ ایضاً، ص ۱۰۳

۶۳ ایضاً، ص ۱۰۹

۶۴ ایضاً، ص ۱۱۵

۶۵ ایضاً، ص ۱۱۷

۶۶ ایضاً، ص ۸۔۱۲۷

۶۷ ایضاً، ص ۱۸۶

۶۸ ایضاً، ص ۱۲۰

۶۹ ایضاً، ص ۱۸۸

۷۰ ایضاً، ص ۷

۷۱ ایضاً، ص ۹

۷۲ ایضاً، ص ۱۰

۷۳ ایضاً، ص ۱۰

۷۴ ایضاً، ص ۱۲

۷۵ ایضاً، ص ۲۴

۷۶ ایضاً، ص ۴۱

۷۷ ایضاً، ص ۴۳

۷۸ ایضاً، ص ۳۲۶

۷۹ کار جہاں دراز ہے قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۹

۸۰ ایضاً، ص ۹

۸۱ ایضاً، ص ۱۱

۸۲ ایضاً، ص ۲۷

۸۳ ایضاً، ص ۳۳

۸۴ ایضاً، ص ۳۳

۸۵ ایضاً، ص ۳۲

۸۶ ایضاً، ص ۱۷۶

۸۷ ایضاً، ص ۱۸۴

۸۸ ایضاً، ص ۱۸۵

۸۹ ایضاً، ص ۲۱۷

۹۰ ایضاً، ص ۲۳۰

۹۱ ایضاً، ص ۲۳۶

۹۲ ایضاً، ص ۳۵۴

۹۳ ایضاً، ص ۳۵۴

۹۴ ایضاً، ص ۳۹-۴۳۸

باب دوم

قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں
قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

ناولٹ کی تعریف آغاز وارتقا

اردو ناولٹ کی آج تک کوئی بھی مکمل تعریف مورد وجود میں نہیں آئی اس صنف کے بارے میں وزیر آغاز یوں رقمطراز ہیں:

> ''صنف ادب میں شاید ناولٹ واحد صنف ادب ہے جس کے بارے میں آج کے علمی وادبی حلقہ ایک گومگو کے عالم میں مبتلا ہیں۔بعض حلقے ناولٹ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ ناولٹ اورطویل مختصر افسانے میں ایک حد فاصل قائم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔بعض دوسرے حلقے ناولٹ کے اجزا ترکیبی کے بیان میں ناول کی ممتاز خصوصیات ہی پیش نظر رکھتے ہیں اور یوں ناول اورناولٹ کو گڈمڈ کردیتے ہیں۔ایک حلقہ ناولٹ کے وجود سے ہی منکر ہے اوراسے ایک علیحدہ صنف ادب تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔''[1]

وزیر آغا کے اس قول سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ناول اور ناولٹ میں حد فاصل قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ناول، ناولٹ اورافسانہ کی ابھی تک کوئی جامع تعریف متعین

نہیں کی گئی ہاں ایک حد تک ناول اورافسانہ کی تعریف ہوئی ہے مگر ناولٹ میں ابھی تک کوئی مکمل تحقیق بھی نہیں ہوئی۔

ناولٹ کی تعریف اور تشریح کا دائرہ ابھی تک بہت ہی محدود ہے۔ ناول اور ناولٹ کے فرق کو واضح کرنا بہت مشکل ہے ۔ اردو ناول میں زندگی کے جن مسائل اور معاملات کی عکاسی کی جاتی ہے ناولٹ بھی انہیں مسائل کا عکاس ہوتا ہے۔ایک بات ضررو ہے کہ ناول میں وسعت زیادہ ہوتی ہے اورناولٹ میں تھوڑی وسعت کم ہوجاتی ہے ۔ ناول میں صفحات کی تعداد محدود نہیں ہوتی بلکہ ہزاروں کی تعداد میں صفحات ہوتے ہیں مگر ناولٹ میں ایک سو یا ڈیڑھ دوسو صفحات تک ہی ناولٹ محدود ہوکے رہ جاتا ہے ۔ ناولٹ میں کرداروں کی تعداد بھی ناولوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے ۔ اردو ناقدین نے ناولٹ کے بارے میں مختلف رائیں قائم کی ہیں۔احسن فاروقی نے ناول ، ناولٹ اورافسانہ کے بارے میں اپنی رائے یوں قائم کی ہے۔

> ''تینوں اصناف بالکل ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں ۔تینوں میں زندگی کے نقشے ایک ہی سطح پر پیش کئے جاتے ہیں اور ذریعہ کچھ واقعات اوران سے وابستہ کچھ کردار ہوتے ہیں۔ فرق صرف پیچیدگی کا ہے ۔مختصر افسانے کوزندگی کا ایک تار کہتے ہیں ناول کو تاروں کا ایک جال کہتے ہیں۔ اورناولٹ میں چند تار بٹ کر ایک موٹا تار بنتا ہوا نظر آتا ہے۔''[۲]

ڈاکٹر محمد حسین ناولٹ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم شاعر اورادیب کے نظریات سے مکمل اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی اس کے فن پارے سے جمالیاتی لذت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ ہم ان نظریات کے لئے اسے نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان نظریات کے پیچھے اس کی شخصیت کا کتنا سوز ،کتنی صداقت اور کتنی گہری وابستگی چھپی ہے ۔اس کے تجربے کی کیسی گرمی اور Vividness ہے اس سے متاثر ہوتے ہیں''[۳۲]

افسانہ اور ناولٹ کا موضوع کے اعتبار سے اگر بات کی جائے تو دونوں انصاف میں موضوع کا کوئی امتیاز نہیں برتا گیا موضوع دونوں کے تقریباً ایک جیسے ہیں۔طوالت کے لحاظ سے ناول اورناولٹ میں بہت فرق ہے مگرافسانے اورناولٹ میں طوائف کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا بعض افسانے تو سو ڈیڑھ سوصفحات کے ہوتے ہیں اوربعض ناولٹ پچاس صفحات کے بھی ہوتے ہیں مگرناولٹ اورناول میں صفحات کے اعتبار سے فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے:۔

''صرف صفحات کی تعداد کے اعتبار سے ناول اورناولٹ میں امتیاز کرنا تو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچنے کے لئے کچھ واضح اصول وضع کرنا ہی مناسب ہوگا ۔ ہمارے یہاں ہی نہیں مغرب کی زبانوں میں معیاری ناولٹوں کے مقابلے میں کم تر درجے کے ناولٹوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے ۔قبول عام اسی درجہ کے ناولٹوں کو حاصل ہوتا ہے مگرصرف عوام کی پسند

ادب کا معیار نہیں ہوسکتی۔ معیاری ناولٹوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی جائے گی اس صنف کے اصول اور میزان کا تعین بھی آسان ہوتا جائے گا۔''[۴۹]

اردو ناول کا آغاز تو نذیر احمد سے ہوا اور ابتدائی منزلیں طے کرتے ہوئے عروج تک پہنچا۔ مگر آج دن تک ناولٹ کی کوئی جامع تعریف نہ ہوسکی البتہ چند ناقدین نے اپنی اپنی رائے اس صنف کے بارے میں ضرور قائم کیں اور ناول اور افسانہ کے بیچ کی کڑی ہی ناولٹ کہلایا۔ مگر ناولٹ کا آغاز کب ہوا اس بارے میں بھی کوئی جامع تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی مگر ایک بات ضرور ہے کہ یہ صنف ناول کے ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھتی رہی۔ ابتدائی دور میں مختصر ناولوں کو ناولوں کے زمرے میں ہی رکھا گیا۔

نیاز فتح پوری نے آسکر وائلڈ سے متاثر ہوکر ''شہاب کی سرگذشت'' اور ایک اور ناولٹ ''ایک شاعر کا انجام'' جیسے قابل قدر ناولٹ تحریر کئے۔ ٹھیک اسی طرح مجنوں گورکھپوری نے ٹامس ہارڈی کے ناولوں سے متاثر ہوکر بہت سے مختصر ناول لکھے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست مجنون کے مختصر ناولوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''مجنوں کی ناول نگاری کی اصلی اہمیت اس پر منحصر ہے کہ ان کے ناول اس دور کے ناول نگاری کے اور اس دور کے اہم رجحانات کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار مروجہ اخلاقی اور مذہبی پابندیوں میں جکڑے ہوئے نہیں ہیں۔ خاص طور سے محبت اور شادی کے معاملات میں ان کے

کردار مروجہ سماجی اور اخلاقی بندھنوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے
۔''۵

یلدرم اور مجنوں کے دور کے بعد منشی پریم چند کا دور آتا ہے ۔ پریم چند کے سامنے موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی انہوں نے دیہاتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا اور پایا کہ بڑے بڑے زمینداروں اور ساہو کاروں کے درمیان عام غریب کسان بری طرح پھسا ہوا ہے۔اس کے علاوہ عورت پر سماج میں ہو رہے ظلم وستم اس کی مرضی کی خلاف شادی وغیرہ پر انہوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں ۔''غبن''ان کا ایک مختصر ناول ہے پریم چند کا دور ناول نگاری کے عروج کا زمانہ تھا۔ناول کے فن کی گہرائیاں بھی واضح ہو چکی تھی۔

منشی پریم چند کے عروج کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ترقی پسند تحریک کا آغاز روسی انقلاب سے جڑا ہوا تھا۔اس نے جہاں تمام اصناف کو متاثر کیا وہیں ناول پر بھی اس انقلاب کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی انقلاب سے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا ۔ ۱۹۳۲ء میں ترقی پسند تحریک کا اجلاس لندن میں ہوا۔جس میں تمام دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ادباء اور طلباء نے بھی شرکت کی۔ ہندوستانی ادیبوں میں سجاد ظہیر کا نام بہت اہم تھا۔ ان کا ایک مختصر ناول ''لندن کی ایک رات'' قابل ذکر کارنامہ ہے۔ ان ادیبوں کے بعد کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کا نام آتا ہے جنہوں نے مختصر ناول اور مختصر افسانے کو اردو ادب میں پروان چڑھایا ۔ ڈاکٹر صبا عارف ان ادیبوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

منشی پریم چند نے جس افسانے کی بنیاد رکھی وہ مختصر تھا لیکن ان

کے بعد کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی نے طویل مختصر افسانے کو اردو ادب میں رائج کیا ۔ دونوں فنکاروں نے اپنے اسلوب اورکمال فن کی بدولت عالمی ادب میں مقام حاصل کیا ۔عزیز احمد، حیات اللہ انصاری قاضی عبدالستار وغیرہ کہ یہاں طویل مختصر افسانے پائے جاتے ہیں۔ ان فنکاروں نے ناولٹ بھی لکھے ان کے طویل مختصر افسانے کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا افسانہ اپنے واقعات ،کردار اورمنظر کشی کے سبب مختصر افسانے سے کچھ بڑھ گیا ہے۔[٦]

اردو کا پہلا ناولٹ کون سا ہے اس بارے میں اختلاف رائے پائی جاتی ہے۔ سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات' کرشن چندر کا پیار ایک خوشبو، راجندر سنگھ بیدی کا ایک چادر میلی سی وغیرہ ابتدائی ناولٹ ہیں۔ ان میں پہلے ناولٹ نیاز فتح پوری ''شہاب کی سرگذشت'' اور مجنوں گورکھپوری نے بھی ابتدائی ناولٹ لکھے ۔لیکن موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ''لندن کی ایک رات'' پہلا ناولٹ کہلاتا ہے۔ حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد ، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے مختصر ناول اس سے پہلے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ لیکن مکمل طور پر سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اردو کا پہلا ناولٹ کہلاتا ہے۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کے ناولٹ کا تعلق ہے تو انہوں نے بیسویں صدی کے چھٹی دہائی میں ناولٹ لکھنے شروع کئے ۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا ناولٹ ''سیتاہرن'' ہے ۔ جو ١٩٦٠ء یہ نیا دور کراچی سے قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد ''چائے کا باغ'' ١٩٦٥ء حلقہ

ادب بمبئی ہاؤسنگ سوسائٹی ۱۹۷۷ء چوہدری اکیڈمی لاہور اس سے پہلے یہ رسالوں میں ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو جون ۱۹۷۷ء بیسیویں صدی اور دلربا ۱۹۷۶، ء میں رابعہ بُک ہاؤس لاہور سے شائع ہوا۔

اب چونکہ میرا موضوع ''قرۃ العین حیدر کے تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر'' ہے۔لہٰذا میرا ایک باب ان کے ناولٹ میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہے تو اب بات ان کے ناولٹ کی ہونی چاہئے لہٰذا میں اپنے موضوع پر آتا ہوا اور سب سے پہلے ان کا پہلا ناولٹ ''ستیا ہرن'' ہے۔لہٰذا اس ناولٹ میں موجود مشترکہ تہذیب پر بات ہونی چاہئے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ستیاہرن

''ستیاہرن'' قرۃ العین حیدر کا پہلا اور بہت ہی مشہور ناولٹ ہے ۔اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے کو اپنا موضوع بنایاہے ۔اس ناولٹ میں ہمیں تمام مذاہب کے کردار ملتے ہیں اورتمام اپنے اپنے مذاہب کی عکاسی کرتے ہیں۔اس ناولٹ میں ہندو ،مسلم ،عیسائی ،تمام مذاہب کے لوگ ہونے کے علاوہ ہندوستان ، پاکستان اور یورپی اور امریکن لوگوں کے کردار بھی نظر آتے ہیں۔غرض یہ کہ اس ناولٹ میں ہمیں جابجا قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس ناولٹ میں خواہ وہ کرداروں کے حوالے سے بات کی جائے یا رہن سہن کلچر ،زبان ہر طرح سے ہمیں اس ناولٹ میں مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں نظر آئیں گی ۔اس ناولٹ کی کہانی تقسیم ہند اوراس کے بعد

پیدا صورت احوال پر مبنی ہے۔ستیا ہرن میں سیتا میر چندانی اس ناولٹ کا اہم کردار ہے۔ جو پورے ناولٹ میں مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ ناولٹ کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے۔

سیتا میر چندانی کا آبائی وطن پاکستان سندھ کا علاقہ تھا۔تقسیم ہند کے بعد سیتا کا خاندان مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچتا ہے اور یہاں کے رفیوجی کیمپوں میں رہنے لگتے ہیں ۔ چونکہ تقسیم ہند سے ہندوستان کے مسلمان پاکستان اور پاکستان کے ہندو ہندوستان میں آ کر بسے یہاں سے جو مسلمان اپنی جگہیں اور گھر چھوڑ کر پاکستان چلے گئے لہٰذا وہاں سے آئے ہوئے ہندو ان چھوڑی ہوئی جگہوں اور مکانوں میں رہنے لگے تھے ۔ سیتا میر کے گھر والے بھی قرول باغ میں ایسے ہی ایک مکان میں آ کر رہنے لگے ۔ مکان کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا جبکہ کراچی میں ان کی اپنی بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کا بچپن نہایت ہی خوشگوار ماحول میں گذرا۔ اس کی ماں ایک مذہبی عورت ہے جو ہر وقت گیتا اور رامائن کا پاٹھ پڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ کام کرتے وقت بھی وہ پاٹھ کا ورد کرتی رہتی ہے اور بچوں کو شور وغل مچانے پر کچھ اس طرح سے ڈانٹتی ہے :۔

> ''اماں............'' ہما نے دروازے میں آ کر کہا......آنند روے جا رہا ہے، ذرا آ کر چپ کرایئے............''
>
> لڑکی تو مجھے کبھی بھی چین سے بیٹھ کر پاٹھ نہیں کرنے دیتی کتاب ہاتھ میں لئے بڑبڑاتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں گئیں اور آنند کو گودی میں لٹا کر دوسرے گھٹنے پر کتاب رکھ لی اور ہلکورے

دے کراسے سلاتے ہوئے بولیں...........''لے تو بھی سن

.... رام نام سن کر دیکھوں تو تو کیسے اپنی اماں کو تنگ کرتا ہے

.... پھرانہوں نے مزید چوپائیاں پڑھنا شروع کیں۔''ے

والدین کے اتنے مذہبی ہونے پر بھی سیتا بہت آزاد خیال بن چکی تھی۔ دہلی میں آکران کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہوئی لہٰذا سیتا کو اس کے ماموں کے ہاں کنیڈا بھیج دیا جاتا ہے وہاں اس کا داخلہ کولمبیا یونیورسٹی میں کروایا جاتا ہے ۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک پاکستانی نوجوان جمیل سے ہوتی ہے ۔جمیل ایک مسلم نوجوان ہوتا ہے اوراعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے ۔ ملاقاتوں کا سلسلہ آگے چل کر کافی گہرا ہوجاتا ہے اوراسی دوران وہ وہاں شادی بھی کرلیتی ہے۔ یہ راز سیتا اپنے گھر والوں سے چھپا کر رکھتی ہے ۔ شادی کے کچھ سال بعد ان کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوتا ہے ۔جس کا نام راہل رکھا جاتا ہے ۔ کچھ عرصہ تک سیتا اور جمیل کی زندگی کافی خوشگوار گزرتی ہے ۔اس کے بعد جمیل دفتر کے کاموں میں زیادہ مصروف ہوجاتا ہے گھر میں سیتا اکیلی رہتی ہے۔اسی دوران سیتا کی ملاقات جمیل کے دوست قمر السلام سے ہوتی ہے۔قمر الاسلام جمیل کی ناموجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوجاتا ہے۔نفسیاتی پیچیدگیاں اورایک نامعلوم سی خواہش ستیا کوقمر الاسلام کے قریب کردیتی ہیں۔ستیا جمیل کی غیرموجود میں قمر الاسلام سے ملتی جلتی رہتی ہے ۔ ان میں ملاقاتوں کے درمیان ان کی عشقیہ داستان پروان چڑھنے لگتی ہے اور بعد میں جب اس بات کاعلم جمیل کو ہوتا ہے تو وہ ستیا کو مار پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیتا ہے جس کو سیتا کچھ اسطرح بتاتی ہے:۔

''ایک روز قمر مجھے بتائے بغیر جمیل کے پاس اس کی بار میں گیا اوراس سے کہنے لگا جمیل مجھے تمہاری بی بی سے عشق ہوگیا ہے............!''گڈ گاڈ......نو......عرفاں نے کہا۔

جمیل بھی پہلے یہ سمجھے کہ قمر اپنے ڈرامے کا ڈائیلاگ بول دیا ہے مگر جب ساری بات ان کی سمجھ میں آئی تو انہوں نے پہلے قمر کی ٹھکائی کی ہوگی پھر گھر آ کر تمہاری ٹھکائی ہوگی اچھی طرح............''

''آپ کو کیسے معلوم؟'' ستیا نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے اگر میں جمیل کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔''

انہوں نے بالکل یہی کیا۔انہوں نے قمر کے بھی خوب گھونسے لگائے اور گھر آ کر مجھے بھی خوب مارا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جمیل جیسے مدھر اورنرم مزاج کے آدمی پر اتنا جنون سوار ہوسکتا ہے اُنہوں نے مجھے خوب مارا۔''

جمیل کے گھر سے نکالنے کے بعد ستیا قمر کے پاس جاتی ہے۔قمر بھی اسے ٹال مٹول کر واپس جانے کا مشورہ دیتا ہے مگر واپس گھر میں جمیل اس کو آنے نہیں دیتا۔ سیتا اپنے بچے کو وہیں چھوڑ کر ہندوستان واپس آجاتی ہے۔اس کے بعد سیتا کی زندگی میں بہت سے راون (مرد) آتے ہیں مگر زندگی اسے اکیلے گذارنے پڑتی ہے۔

سیتا ہرن کی سیتا کے متعلق سیما صغیر نے اپنے ایک مضمون ''ستیا ہرن۔ ایک مطالعہ میں کچھ اس طرح اپنے تاثر بیان کرتی ہیں:۔

''یہ آج کی دنیا کا راون کیا ہے؟ کیا یہ مغربیت کا اثر ہے؟ کیا یہ جدید دور کی چکا چوند ہے جہاں ہر چیز بدلی ہوتی نظر آرہی ہے۔ اس بدلاؤ میں جس رفتار سے ستیا میر چندانی بدلی ہے شاید اس رفتار سے زندگی نہیں بدلی۔ وہ زندگی اور حالات سے آگے نکل گئی ہے وہ اپنی مرضی سے اپنے عمل کا انتخاب کرتی ہے۔ اس کے فیصلے دراصل اس کے وجوری تجربہ کا حصہ ہیں۔ ایک آزاد اور خود مختار جدید عورت جو اپنے تمام فیصلوں کے لئے خود ذمہ دار ہے۔ وہ وقت یا تاریخ کے جس لمحہ میں زندہ ہے اس میں اس کی جبلتیں ناآسودہ رہ گئی ہیں۔''[۸]

آخر کار جمیل ستیا کو طلاق دے دیتا ہے۔ سیتا خوش ہوجاتی ہے کہ آخر اب میں دوسری شادی کسی اور سے یا عرفان سے کرسکتی ہوں۔ اصل میں اب وہ عرفان سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر عرفان بھی اسے دھوکہ دیتا ہے اور شادی کہیں اور کر دیتا ہے۔

''اب تک وہ قانونی طور پر مسز جمیل تھی۔ مگر اب کہ یہ کاغذ امریکہ سے آچکا ہے۔ خود کو مسز عرفان کہلانے کا حق اب کوئی اس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ جلد از جلد شادی کرلیں گے عرفان اب

اس کا ''عاشق'' نہیں ہوگا ...... اس کا ''شوہر ہوگا۔ مجازی خدا............ دیوتا............ سب رشتوں سے اتم مقدس خوبصورت ، پیارا رشتہ .... اس کا قانونی شوہر............ وہ تیزی سے زینہ طے کرکے اوپر آئی ۔اوراپنے فلیٹ کے دروازے پر جاکرزور زور سے گھنٹی بجانے لگی۔ دروازہ کھلا ۔ اندر سے ایک اجنبی صورت نے سرنکالا۔ ''کون............؟''

''میں مادام عرفان ہوں............''۹

یہاں سیتا ٹوٹ جاتی ہے ۔ساری زندگی سیتا مشکلات سے مقابلہ کرتی رہی مگر اب وہ ہار چکی ہے۔عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اورمرد ہمیشہ سے عورت کا ناجائز استعمال کرتے رہیں ہیں آج بھی ہماری سوسائٹیMan dominated سوسائٹی ہےاس میں کوئی شک نہیں۔

جہاں تک اس ناولٹ ''ستیا ہرن'' میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کی بات ہےتو اس ناولٹ میں یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک ہندولڑکی کی کسی مسلمان لڑکے سے شادی ہوگی تو مشترکہ تہذیب کے عناصراس کہانی میں ہمیں ضرورملیں گئے ۔ستیا ایک ہندولڑکی ہے اوراس کی شادی ایک مسلمان جمیل نام کےلڑکے سے ہوتی ہے ۔تقسیم کے بعد اس کے گھر والے پاکستان سے منتقل ہوکر ہندوستان میں آئے وہاں سندھ میں تو مشترکہ تہذیب تھیں ہی بلکہ جہاں وہ مستقل ہوکر رہنے لگے دہلی میں تو وہاں بھی مشترکہ تہذیب صدیوں سے موجودتھیں۔ سیتا کی دوسری شادی جب عرفان نام کے ایک مسلمان

سے ہوتی ہے تو وہ یعنی سیتا ہندوستان میں قدیم مشترکہ تہذیب کے بارے میں کچھ اس طرح سے بتاتی ہے:۔

''پھر یہاں بدھ مت خوب پھیلی اور یہاں سرسوت برہمن رہتے تھے اور راجپوت اور جاٹ اورشہر کے باسی حملے کے وقت پنجاب بھاگ گئے ۔ میری ممی لاہور کی ادورہ ہیں۔ سندھی لوگ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے پرانے مذہب کی عزت کرتے رہے ۔ بے شمار درگاہیں بن گئیں۔ ان سب پیروں کا ایک نام ہندو تھا اور ایک ایک محمڈن............''

''اچھا واقعی............''

''ہاں راجہ بھرتری لال شہباز بنے ۔ پیر پٹو، پیر سلطان۔ زندہ پیر خواجہ خضر اور دیر وال شیخ طاہر بن گئے ۔ لالو جسراج منگو پیر بنے ۔''۱۰

اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ لوگ چاہئے کسی بھی مذہب کے ہوں وہ ایک دوسرے کے مذہب کی عزت واحترام کرتے تھے ۔ ستیا جب مسلمان کے گھر ہاں شادی کر کے آئی اس کے بعد اس کی مسلمان رشتہ دار عورتیں اس کو سندور کے بارے میں پوچھتی ہیں کہ تو نے کیوں نہیں سندور لگایا۔ مگر جب ملک تقسیم ہوا تو اس وقت اس مشترکہ تہذیب کی دھجیاں اڑئی لوگ پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان کی طرف بھاگے ۔ اپنے اثاثے اپنے مندر اپنی مسجدیں سب کو

چھوڑنی پڑی ایسی مشترکہ تہذیب کو بھی لوگ بھول گئے ۔ اور انسانیت کا قتل عام ہوا۔ اس ناولٹ میں جب عرفان سیتا کو سیر کروا رہا ہوتا ہے تو ایک ٹیلے پر ایک مندر ہوتا ہے جس کی دیواروں پر کچھ اس طرح سے لکھا ہوتا ہے :۔

''دیوی ماں میں ہندوستان جارہا ہوں ۔ مجھ پر اپنی دیا رکھنا۔
۱۲رنومبر ۴۷ء''
''بھگوان میں آج تمہارا شرن چھوڑ کر ہندوستان بھاگ رہا ہوں مجھے معاف کردو ۱۹ردسمبر ۴۷ء''
''ماتا میں تم کو چھوڑ رہا ہوں ۔ اب کبھی پرشاد نہ چڑھا سکوں گا میرے بچوں پر دیا کرتی رہنا ۱۹ردسمبر ۴۷ء''
سیتا اورعرفان ڈھونڈ ڈھونڈ کران جملوں کو پڑھتے پھرتے ، ہمارے تک کہ مہران کی لہروں میں ڈوب گیا۔''۱۱

دریا ندی ہوا جنگل یہ سب مشترکہ ہوتے ہیں ان کا کوئی مذہب کوئی دین نہیں ہوتا ۔ دریا سندھ کی ہندو پوجا کرتے تھے ۔ ستیا کردار کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے کہلوایا ہے:۔

''سندھ نہ میرا ہے کہ پیراللہ بخش جمالی کا ۔ سندھ کے مالک وہ ہاری ہیں جس کے متعلق سوچنے کی تم نے آج تک ضرورت ہی نہیں سمجھی ہوگی۔''۱۲

اس ناولٹ میں جہاں مشترکہ تہذیب کے عناصر جابجا ہیں وہیں اس ناولٹ میں عورت کے مقام پر بھی سوالیہ نشان ہیں۔ ایک عورت کس طرح اپنے گھر کی تلاش میں ساری زندگی بھٹکتی ہے اس کی عزت کا کھلواڑ اوراس کی شرافت کا کیسے ناجائز فائدہ ہمارے سماج میں اٹھایا جاتا ہے۔ اپنے پتی اپنے بچے کو پانے کے لئے ستیا ساری عمر کس طرح کشمکش کرتی رہتی ہے قرۃ العین حیدر نے اس کی ترجمانی سیتا کے ذریعے کچھ اس طرح سے کی ہے۔

''وہ مجھے طلاق نہ دے کر اچھی طرح سزا دیناچاہتے ہیں۔ قصور سراسر میرا تھا۔ میں نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔ میں کئی مہینے تک متواتر دوپہر کویارات کو جب بھی موقع ملتا قمر کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ اس کے دوستوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کی مسٹریس بن چکی ہوں۔

لیکن جس وقت جمیل نے مجھے گھر سے نکالا میں بہت دیر باہر بارش میں سائیڈ واک پر گھڑی رہی۔اگر اس مرتبہ وہ ایک بار بھی دروازہ کھول کر صرف اتنا کہہ دیتے سیتا............ بارش میں مت بھیگو............ اندر آجاؤ............تو میں ......تو میں واپس جا کر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی............عمر بھر انکو دھوکا نہ دیتیں مگر دروازہ اسی طرح بند رہا۔اندر سے راہل کے رونے کی آواز آرہی تھی۔''۱۳

ستیا ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود عمر بھر اس کے دل میں جمیل کے لئے اور اس کے بیٹے کے لئے ہمدردی اور وفاداری رہی اس کے رشتہ داروں سے اس کے گہرے مراسم رہے ۔کبھی بھی اس عورت نے کوئی مذہبی جانبداری دکھائی نہیں دیتی بلکہ ہر وقت قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو قائم رکھا۔جمیل کی بہنوں کے ساتھ اس کے جمیل کے ساتھ تعلقات بگڑ چلے تھے اس وقت بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی وجہ سے ان میں کوئی مذہبی اختلاف پیدا ہوں۔ اس پورے ناولٹ میں ہر جگہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں ملتے ہیں ۔مشترکہ تہذیب جو تمام مذاہب کے لوگ یہاں قائم رکھتے ہیں اس کی مثال ہمیں محرم کے مہینے میں خوب دیکھنے کو ملتی ہے اور اس ناولٹ میں بھی اس چیز کی عکاسی کچھ اس طرح سے کی گئی ہے:۔

’’مجھے وہ تلسی پور کا محرم یاد آ گیا۔کیا خواب کا ایسا وقت گزرا تھا اور وہاں میں نے ایک بات اور عجیب دیکھی کہ وہاں مجلسوں میں اکثر پنجابی اور سندھی شرنارتھی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔فرخندہ باجی نے بتایا کہ تقریباً ساری۔ یو۔پی اسٹیٹ میں ہی ہورہا ہے آج کل............دیکھئے کلچر پیٹرین کس طرح بدلتے ہیں!............ تلسی پور میں ان سیدوں کے گھر خالی پڑے ہیں جو پاکستان چلے گئے مگر کوئی شرنارتھی ان میں نہیں رہتا کہ سیدوں کے گھروں کی بے ادبی ہوگی............ اس طرح سندھ اور پنجاب میں سیدوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی نا............‘‘

آپسی بھائی چارے کی مثال اس سے بڑھ کر اس ناولٹ میں اور کیا دی جاسکتی ہے کہ جب یہ لوگ پاکستان کی سیر کر کے ہندوستان واپس آنے لگے تو لاہور اسٹیشن پر ناموں کے مسئلے پر اختلاف ہوگیا چونکہ ستیا کا نام اب ستیا نہیں بلکہ سیتا جمیل تھا لہٰذا Conflict پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:۔

''لاہور اسٹیشن پر انڈیا جانے والی ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے پلیٹ فارم کی سلاخوں کے ادھر بیٹھے ہوئے کانسٹیبل نے کاغذات کی خانہ پری کے لئے سوالات شروع کئے تو ایک خانہ پر آ کر اس نے پوچھا۔''

''مذہب......؟''

سب گڑ بڑا گئے ......بلقیس فارم مکمل کروا کے ٹرین کے قریب کھڑی رشتے داروں سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ نادر اور عرفان سیتا کے ساتھ پولیس کی میز پر موجود تھے۔ کانسٹیبل نے پاسپورٹ کھول کر دوبارہ دیکھا............اور ویزہ پر نگاہ دوڑائی۔

نام: مسز سیتا جمیل

سفر کا مقصد: عزیزوں ملنے پاکستان آئی تھی ۔

شوہر کی قومیت: جمہوریہ ہند کا شہری۔

اس نے پھر ایک مرتبہ سیتا پر نظر ڈالی۔ عجب سا نام ہے۔ ماتھے پر بندی لگا رکھی ہے ۔ پاکستان سے انڈیا جارہی ہیں۔ خاصا پراسرار معاملہ تھا۔

''مذہب............؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

یہ سوچنا پڑے گا............فری تھنکر لکھ دیجئے ....''

عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔

کانسٹیبل نے لکھ دیا۔

''ہاہاہا ....''نادر نے قہقہہ لگایا............''بھائی جان فری تھنکر............!'' ساری شگون بڑی خالہ سے پوچھ پوچھ کر تلسی پور میں کرتی تھیں۔ جب جمیل بیمار پڑ گئے تھے۔ ہاہا............''

''ہاہاہا............''عرفان نے بھی کھوکھلی ہنسی ہنسا۔

''ہاہاہا............'' سیتا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔[۱۴]

اس طرح مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''سیتا ہرن''میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر بہت حد تک موجود ہیں۔ جو مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔

دُلربا

''دُلربا'' قرۃ العین حیدر کا بہت اہم ناولٹ ہے۔ اس کو قرۃ العین حیدر نے نو ابواب یا حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے لکھنؤ کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ لکھنؤ کا معاشرہ جس طرح کی عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا تھا کس طرح وہاں کے نواب عیاش پرست تھے اس بات کو اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب امراء اور نوابوں کی عروج وزوال ان کی اولاد کی

عیاشی اور ان کے سب کاموں کو اس ناولٹ میں بڑی بے باکی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے بیان کیا ہے۔

کہانی کا آغاز ڈرامہ کمپنی کا ڈرامہ ختم ہونے اور پردہ گرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس ناولٹ کے اہم کردار گلنار بائی اس کی والدہ گلزار بائی پارسی ٹیچر رستم جی پسٹن اور لکھنؤ کے نواب زادے شجو ، للو، منوا، ببو ، سید رفاقت حسین، مرزا گڑگڑی میر حقہ وغیرہ اس ناولٹ کے اہم کردار ہیں۔

ڈرامہ جوں ہی ختم ہوتا ہے شجو ، للّو ، منوا، ببو، برقعہ پہن کر گلنار بائی کے کمرے میں چلے جاتے ہیں وہاں گلنار ہار سنگار اتار رہی ہوتی ہے۔لڑکوں کو اچانک اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہوجاتی ہے ۔ وہ چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہے ۔آواز سن کر باہر سے باقی لوگ اندر داخل ہوتے ہیں تو اندر لڑکوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ اندر ہیروئن کے پاس کوئی بھی اتنی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔گلنار جب لڑکے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو وہ سوچتی ہے کہ کوئی چور آ گئے ہیں ۔گلنار بائی کی آواز سن کر جب باقی دوست واحباب اس کے پاس آتے ہیں تو وہ ان کو اس طرح سے ڈانٹتی ہے:۔

''ایک بڑی شکل والی عورت کمرے میں گھسی، لال لہنگا ، نیلا شلوار ،ہرا دوپٹہ، ناک میں بلوق ، خاصی بندریا، سخ پھٹکار زدہ صورت، گلنار بائی اس پر برس پڑی۔کلموہی مال زادی ۔ میں یہاں لٹ جاؤں۔ ڈکیٹ آن پڑیں، ٹھگ ان گھسیں۔کھیل ختم ہوا

نہیں اورتم سب چرس کا دم لگانے بیٹھ گئے ۔ دروازہ کس نے کھلا
چھوڑا ؟۔ ارے یہ تو اسکول کے چھوکرے نکلے ۔ جو بدمعاش آ چکے
ہوتے تو؟ اور منڈے کے چوکیدار سب انفلوئنٹز میں مر گئے کیا ؟
منو بھسم ہوگیا......؟ اس کی گود میں کیڑے پڑیں۔ ڈھائی گھڑی کی
آئی۔ مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔'' ۱۵

گلنار بائی لڑکوں کا تعارف معلوم کرتی ہے تو اس وقت اسے حیرانی ہوتی ہے کہ یہ جو لڑکے تھے ان میں شجو ''سید شجاعت حسین'' کوئی عام انسان نہیں بلکہ بہت بڑے لکھنؤ کے نواب زادہ ہوتا ہے ۔ اس کے ماموں کی لکھنؤ میں بڑی عزت واحترام ہوتا ہے جس کا نام سید رفاقت حسین ہیں۔ شجو کے والد کا انتقال ہو چکا ہوتا ہے اور وہ ماموں کے گھر رہتے ہیں۔ ناٹک دیکھنے کا شجو کو بہت شوق ہوتا ہے ۔ اس کو دیکھ کر گلزار اور اس کی بیٹی گلنار دونوں سمجھ جاتے ہیں کہ شجو میاں اس خاندان کی اہم ہستی ہے جس کے ذریعے ہم یہاں عیش وآرام پا سکتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد شجو ان کو اپنے پڑوس میں لے آتے ہیں اس کے بعد اس کے ماموں ان کو وہاں سے نکال دیتے ہیں جس کا افسوس گلنار اور گلزار دونوں ماں بیٹی کو ہوتا ے اور ورہ اس کا بدلہ لینے کے لئے مختلف ترتیبیں سوچتی ہیں وقت گذرتا جاتا ہے ۔ گلنار کو سید شجاعت حسین کے وہاں سے نکالے جانے کا افسوس ساری عمر رہتا ہے اور جب وقت اور حالات بدلتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شجاعت جس کی پوتی جوان ہوتی ہے اس وقت حالات ایسے بدلے ہوئے ہیں کہ ان ہی طوائفوں نے اب ہیروئینوں کی جگہ لے لی ہوتی ہے اور شجاعت حسین جو ایک اعلیٰ جج کے عہدے

سے ریٹائرمنٹ لی ہوتی ہے ان کی پوتی گلنار کی فلم کی ہیروئن بڑے چاؤ سے بنتی ہے اور آخر میں گلنار کہتی ہے کہ ''اس کا رساز حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔''

قرۃ العین حیدر کے ان ناولٹ ''دلرُبا'' میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں جابجا ملتے ہیں جہاں گلزار، گلنار، شجاعت، شجو جیسے کرداروں کے ساتھ ساتھ کندن، کنج بہاری لال ماتھر جیسے کردار موجود ہوں تو وہاں ظاہر ہے کہ مشترکہ تہذیب ہمیں ضرور ملی گی۔ یہ ناولٹ لکھنؤ اور ہندوستانی تھیٹر جو اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا اس کی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس ناولٹ میں بھی ہمیں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ملیں گیں۔

اس ناولٹ میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اس قدر بتاتی ہے کہ جب شجو اور منو جو اس ناولٹ کے کردار میں گلنار بائی کے ہاں اندر اس کے کمرے میں نقاب اوڑھے پہنچتے ہیں تو پہلے تو وہ ڈر جاتی ہے پھر جب وہ ہوش سنبھالتی ہے تو ایک طرف بیٹھ کر پان بنانے لگتی ہے اور لڑکوں کو پوچھتی ہے کہ آپ پاں تو نہیں کھاتے جب لڑکے منع کرتے ہیں تو وہ کچھ اس طرح کہتی ہے:۔

> ''گلنار کو اب لطف آرہا تھا کہنے لگی ۔ بیٹھو میاں گھبراؤ نہیں۔
> میں نے کہہ دیا ہے ۔ تمہارے آدمی سیدھے یہاں پہنچا دیئے
> جائیں گے۔
> پان کھاتے ہو؟

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''سگریٹ تو پینا شروع نہیں کیا؟ مت پینا۔ بری عادت ہے''

لڑکے حیران و پریشان گلنار بائی کی صورت دیکھا کیے یہی صاحب جی چند منٹ پہلے اپنے لواحقین کو گالی کونسوں سے نوازتی کتنی بازار اور لچر معلوم ہو رہی تھی۔ پل کی پل میں دوسرا ماسک پہن لیا۔ خوش اخلاق مہذب۔ شفیق۔ ان کم عمر لڑکوں کو ابھی تجربہ نہ ہوا تھا کہ انسان کی شخصیت کے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کے اندر کتنی مختلف اور متضاد ہستیاں چھپتی رہتی ہیں اور بعض لوگ موقع ومحل کے لحاظ سے کس طرح اپنا رنگ بدلتے ہیں۔[۱۶]

قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''دلربا'' میں کردار جو بچوں کے ہیں مثلاً ننو۔ منو۔ شجو۔ ننھے۔ للّو وغیرہ ان میں بھی بھائی چارے اور مشترکہ تہذیب کی عکاسی ہے کیونکہ ان کرداروں سے کبھی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان یا سکھ اور نہ ہی کسی ملک کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ ایک مشترکہ ہندو پاک تہذیب جو صدیوں سے یہاں قائم ہے اس کی عکاسی ہے کہ بچوں میں کبھی بھی اپنا نہیں ہوتا کہ وہ کس قوم کس ملک سے یا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ایک مشترکہ تہذیب کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔

للّو کا اصل نام گھنشیام داس رستوگی۔ بڑے لڑکے کا نام برج بہاری لعل ماتھر جیسے ہندو ہونے پر بھی گلنار بائی نے کوئی مذہب وملت کی بات نہیں بلکہ ایک مشترکہ تہذیب کی

بات کی اوراس کہانی کوآگے بڑھایا۔

قرۃ العین حیدر نے جب اس ناولٹ ''دلربا'' میں کسی تاریخ واقعہ کا ذکرکرتی ہیں تو اس میں بھی ہمیں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ملتے ہیں۔ جب وہ اس ناولٹ میں کوئی بات کرتی ہیں تو وہ سارے ہندوستان کی بات کرتی ہیں جو رنگ ونسل سے پاک زماں ومکاں کی قید سے آزاد ہوتاہے اس ناولٹ میں بھی اس بات کی عکاسی کچھ اس طرح سے کی ہے:۔

> ''گلنار بائی، ماسٹر مراز، پسٹن جی کے ہزار ہا شائقین اور تماشائی سارا ہندوستان جنت نشان اردو پارسی تھیٹر کی مانند ایک Anochronistic تماشا تھا اور زبان وبیان کی قیود سے آزاد۔ جس طرح پارسی اسٹیج پر ہریش چندر، نل رمینتی اور چندروالی، غزلیں اور رستم وسہراب، شہریں وفرہاد بندی بھجن گاتے تھے۔عہد چنگیز خان میں جنگ ٹرانسوال کا ذکر ہوتا ہے اور''عرب وعجم''اور ''ہند قدیم'' کے مسخرے کردار وکٹورین میوزک ہال کی مقبول دھنوں پر باندھی ہوئی چیزیں الاپ کر اودھم مچاتے تھے۔ ہندوستانی مزاج زماں ومکاں کی قیود سے بے نیاز وآزاد ہرتفریح سے لطف واندوز ہونے کے لئے تیار تھا۔''۷؎

جس طرح مندرجہ بالا اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح اردو پارسی تھیٹر میں گہما گہمی تھی کس طرح وہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے اس کی مثالیں انہوں نے

مشترکہ تہذیب کے لوگ مثلاً رستم وسہراب ، شیریں وفرہاد، بندی بھجن گاتے ہیں۔ عہد چنگیز کی بات ہوتی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی مزاج زمان ومکاں کی قیود سے کس طرح آزاد تھا یہ سب باتیں تب ہی ممکن ہیں۔ جبکہ ہمارے سماج میں امن وچین ،سکھ شانتی اور آپسی بھائی چارے کا ماحول ہوگا ۔اور یہ آپسی بھائی چارہ تب ہی ممکن ہے کہ جب لوگوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ ہوگا جس کی مثالیں قرۃ العین حیدر کا یہ ناولٹ ''دلرُ با'' ہے۔

قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''دلربا'' میں جب بات عورت کی ہو یا پھر مرد کی تو اس کو ہندوستانی عورت یا ہندوستانی مرد سے جانا جاتا ہے نہ کہ اس کے مذہب سے یا اس کی ذات سے اس کے فرقے سے اور یہاں کے جو رسم ورواج ہیں وہ بھی مشترکہ ہیں نہ کہ الگ الگ مثلاً ایک جگہ قرۃ العین حیدر اپنے اس ناولٹ میں کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں۔

> ''ہندوستانی عورت گاتی ہے تب بھی بسورتی ہے ۔غزلیں ہیں تو ان میں نالہ فریاد آہ وبکا ،خونِ دل ،خون جگر،کفن ، دفن ،مزار ، قفس، صیاد، جنون، دیوانگی، وحشت صحرا، بے چارے لاٹ صاحب ، چچا ٹھیک تو کہتے تھے ہمارے ہاں اہل یورپ جیسی بشاشت ، چونچالی صحت مندی، جوش حیات، ولولہ سرے سے موجود ہی نہیں۔۱۸؎

یہاں قرۃ العین حیدر گلرو بیگم کے بارے میں کہہ سکتی تھی کہ مسلمان عورت مگر انہوں

نے ہندوستانی عورت کی مثال دی جس میں تمام مذہب کی عورتیں شامل ہوگئی چاہے وہ ہندو ہو یا پھر مسلمان یا عیسائی سکھ اس ناولٹ ''دلربا'' کے آخری اقتباس کو اگر ہم پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک طرف گلنار جس کو سید رفاقت حسین جو لکھنؤ میں ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا جس کا گلنار کو پوری زندگی صدمہ رہا اور وہ بدلہ لینے کے لئے انتظار کرتی رہی اور جب ان کی پوتی حمیدہ اس کے آگے ایکٹریس بننے کے لئے جاتی ہے تو وہ اس کو اپنی بیٹی مانتی میں اور ان الفاظ میں بھائی چارے کی مثال پیش کرتی ہے۔

> ''آپ تو جانتے ہیں میری بیٹی گلرو کے ہاں تین لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے۔ میری والدہ مرحومہ اپنی پرنواسی کا جشن ولادت دھوم دھام سے منانے کا ارمان دل میں لئے لئے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے گلرو کو ایک بنی بنائی بیٹی اور مجھے نواسی عطا کی اور اس کارساز حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔''[۱۹]

مجموعی طور پر ہم قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''دلربا'' کے بارے میں کہہ سکتے ہیں اس میں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھارے کے عناصر ہمیں ملتے ہیں۔

اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو

''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ کا موضوع اودھ کا زوال زدہ وہ معاشرہ ہے جس نے ایک زمانے میں پورے ہندوستان میں سے سب سے خوشحال دن دیکھے تھے ۔ اور اب یہی زوال زدہ معاشرہ غربت، افلاس اور بے چارے گی کی مصیبت بھی جھیل رہا ہے ۔قرۃ العین حیدر پر برابر یہ الزامات لگتے رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ خاندان کی نمائندگی اپنے تخلیقات میں کی ہے ۔ مگر ان کے ہاں اس ناولٹ میں معاملہ تھوڑا دوسرا ہے اور انہوں نے نچلے طبقے کی عکاسی اس ناولٹ میں کی ہے ۔''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' میں انہوں نے نچلے طبقے کے مسائل ان کی زندگیوں کے نشیب وفراز بلکہ یہ کہ اُنہوں نے نچلے طبقے کو ان ناولٹ میں مرکزیت دی ہے ۔ ان کے مخصوص تہذیبی منظر ان کے حالاتِ زندگی کو سمجھنے کی کوشش یہ ناولٹ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' ہے۔

ناوٹ کا آغاز خانگیوں اور چکن کاڑھنے والی مظلوم عورتوں کے مسائل کو پیش کرنے کے لئے کہانی کا آغاز ایک دربار میں عرس کی قوالی سے شروع ہوتا ہے جہاں ناولٹ کا مرکزی کردار امرتی عرف قمرن گانا گاتی ہے ۔ ہنڈے شاہ کے عرس میں گلنا گانا سے اس کو تھوڑا بہت روپیہ پیسہ ملتا ہے۔ اس کو وہ اپنے دوپٹہ میں باندھ لیتی ہے ۔ اس تھوڑی بہت کمائی سے وہ گھر میں رہ رہے دوسری عورتوں کے لئے تھوڑا بہت سامان لیتی ہے ۔

دراصل ان کرداروں کے ذریعے قرۃ العین حیدر اپنے طبقہ کے تضادات اور محرومیوں کو بہت عمدہ طریقے سے پیش کرتی ہیں۔ اس کہانی کا عنوان بہت حد تک پورے ناولٹ

کی عکاسی کرتا ہے جو درجہ ذیل دوہے سے اخذ ہے:۔

اورے ودھا تابنتی کروں تورے یہاں پروں بارم بار
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو، چاہتے نرک دیجو ڈار

اس ناولٹ میں دو بے سہارا بہنوں رشک قمر اور جمیلن کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے ۔ ان کی ماں بچپن میں فوت ہوجاتی ہے اور اس کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کی خالہ کے سر پڑتی ہے ۔ ان میں سے ایک لنگڑی ہوتی ہے ۔ ان کا بچپن کیا پوری زندگی فقیروں کی طرح بہت پریشانیوں اور تکلیفوں میں گزرتی ہے اور بھیک مانگ کر گزارا کرتی ہیں۔ ان کی خالہ ایک حجام سے شادی کرتی ہے اور وہ بھی ان کی مدد کرتا ہے ۔ جب یہ جوان ہوتی ہیں تو کچھ رئیسوں کی مدد سے ان کی جان پہچان امراء طبقہ سے ہوتی ہے ۔ وہاں ان کو مشاعروں میں جانے کا موقعہ ملتا ہے ۔ وہاں سے بڑی بہن ایک رئیس رشک قمر کے چکر میں پھنس کر کراچی چلی جاتی ہے اور جھوٹی لکھنؤ واپس آتی ہے وہاں بڑی مصیبت اور پریشانیوں کی زندگی گذار کر آخر اس دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے ۔ کراچی جا کر بڑی بہن کچھ بدمعاشوں ک ساتھ رہتی ہے وہاں اس کی جوان بیٹی مار دی جاتی ہے اس کے بعد وہ پھر واپس مشاعروں اور ریڈیو کی زندگی میں جانے کی کوشش کرتی ہے مگر اب وہ زندگی کے اس حصے میں ہے کہ اس عمر میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا ۔ چنانچہ وہ مجبور ہوکر اب وہ چکن کا کام کرنے لگتی ہے اس طرح اس کی زندگی جدو جہد میں گذرتی ہے ۔ وہ زندگی سے باہر جانے کے بجائے اس لڑنے کا عزم ظاہر کرتی ہے ۔

قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' عورت کی زندگی سے

تنگ آ کر وہ اگلے جنم میں عورت ہی نہیں بننا چاہتی اس سماج میں جہاں اس کی کچھ قدر نہیں ایک اچھی زندگی جینے کی خواہش میں ان کا کئی بار استحصال ہوتا ہے ۔غربت کے دن دیکھے بچپن میں بھی اور بڑھاپے میں بھی زندگی سے تنگ جوانی میں استحصال ہوا۔اس ناولٹ میں ہمارے سماج ہر ایک گہرا طنز قرۃ العین حیدر نے اس ناولٹ کے ذریعہ کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' میں مشترکہ تہذیب کے عناصر موجود ہیں ۔اس ناولٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کس طرح پیر ہنڈے شاہ کہ جو عرس ہوتا ہے وہاں ہر نہ مذہب کے لوگ اور ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بھائی چارے کے ساتھ آتے ہیں کوئی عرس ہوکوئی تہوار ہو ہمارے لوگ برابر احترام وعزت کے ساتھ مزاروں اور ان خانقاء یہ آتے جاتے ہیں یہی مشترکہ تہذیب ہمارے ملک کی پہچان ہے اور اسی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کوقرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناولٹ ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجیو'' میں پیش کیا ہے جہاں وہ عرس پر لوگ اکٹھے ہیں وہاں یہ نہیں بتایا کہ یہ کس مذہب کس فرقہ سے ہیں بلکہ اس بات کی عکاسی انہوں نے کچھ اس طرح سے کی ہے:۔

''پیر ہنڈے شاہ کے غریبا مٹو عرس میں آنے والے تیلی، جولاہے، کنجڑے، قصائی، بھڑبنجے، کاشتکار کھیت مزدور، جھونپڑوں میں زندگیاں گذار کر کچی قبروں میں دفن ہوئے۔'' [۲۰]

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ تمام طرح کے لوگوں کی عکاسی اس ناولٹ میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثال

پیش کرتی ہے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔''

جہاں ایک طرف اس ناولٹ میں عرس وقوالی کی بات قرۃ العین حیدر نے کی ہے تو دوسری طرف وہ مندر کا ذکر بھی کرتی ہیں اس سے زیادہ اور قومی یکجہتی اور آپنے بھائی چارے کی مثالیں اور کیا دی جاسکتی ہیں۔ ورما صاحب جو اس ناولٹ کا ایک اہم کردار ہیں جب رشک قمر پر عاشق ہوتے ہیں تو اپنی آپ بیتی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> ''بھائی سنو'' ورما صاحب نے سینڈو چز سرو کرتے ہوئے فرمایا۔''پچھلے ہفتے ہم گئے تھے علی گنج کے میلے۔ والدہ کو لے کر۔ وہ بے چاری ہنومان جی کے مندر جاجا کر ہمارے لئے منتیں مانتی ہیں کہ ہم راہ راست پر آجائیں۔۲۱

قرۃ العین حیدر کے اس ناولٹ میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثال مشترکہ زبان بھی ہے۔ اس ناولٹ میں مشترکہ زبان یعنی اگر مسلمان بات کررہاہے تو وہ رام بھگوان کا اپنی گفتگو کرتے وقت ضرور اپنی زبان پر لائے گا اور اگر کوئی ہندو بات کررہا ہے اور سامنے بات کرنے والا مسلمان ہے تو وہ ''خدا کی قسم، اللہ مالک اور دوسری کئی قسمیں مثلاً بھگوان کی قسم ، بجرنگ بلی کی مرضی جیسی جیسی مذہبی باتیں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں اس سے بھی اس ناولٹ میں ایکتا اور آپسی بھائی چارے کی بات ہوتی ہے۔ ایک اور جگہ آگے جب جمیلن کو ورما صاحب فلم انڈسٹری میں ہیروئن بنانے کا لالچ دے رہے ہوتے ہیں تو وہاں کچھ اس طرح کی گفتگو کررہے ہوتے ہیں:

''ورما صاحب نے ایک طویل سانس لی''خیر اللہ مالک ہے ۔کل ان کا شین قاف درست کرنے کی Intensive ٹریننگ شروع ۔ ڈیڑھ مہینے بعد سونگ برڈز کلب کا پہلا پروگرام ریڈیو پر بھی شیڈول کرلیا گیا ہے ۔ کیوں میاں۔ اُنھوں نے سید صاحب سے دریافت کیا۔''قطعی'' انہوں نے پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اور ورما صاحب جمیلن کی طرف متوجہ ہوے اس دوران میں چپکی بیٹھی غور سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔ ورما صاحب نے اسے بڑے دھیان سے دیکھا۔ پھر دفعتاً چٹکی بجا کر بولے ۔کماری جل بالالری......''

''کون؟ ہم ......؟ ہمارا نام جمیل النساء بیگم ہے جمیلن نے بگڑ کر کہا۔

''ارے ہم تمہارا کیریر بنارہے ہیں۔''

''کیریر نہ سر پر ...... یہ کیا ہوتا ہے۔''

تمہارا مستقبل

ارے ہمارا مستقبل اللہ میاں نہ بناپائے۔آپ کیابنائیں گے جمیلن نے خشکی سے جواب دیا۔

''نعوذ باللہ کیا کفر بکتی ہے'' ورماصاحب نے براماں کر کہا۔''۲۲

ٹھیک اسی طرح آگے چل کر اس ناولٹ میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی کی ایک

اور مثال ہمیں اس وقت اس ناولٹ میں ملتی ہے جب یہ صاحب یعنی ورما صاحب فرہاد صاحب کو خط لکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو کچھ اس طرح سے خطوخطابت کرتے ہیں۔

''بھئی معاف فرمائے گا۔ بات یہ ہ کہ آج منگل کی شام ہے ۔ والدہ صاحبہ کو ایک کیرتن میں لے جانا ہے ۔آج تو تشریف نہ لائیے۔ہم اسی وقت نرہی جا رہے ہیں اپنے مکان پر...... جی ہاں جی ہاں بہت بہت شکریہ۔آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔تو اگلے اتوار کو۔ بہت خوب آداب عرض۔

غرض یہ کہ قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں جو ہندوستانی زبان اختیار کی گئی ہے اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے علاوہ اور کچھ نہیں یہ زبان کسی ایک فرقہ ایک ملک ایک مذہب کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی عکاس ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے ناولٹ اس مشترکہ تہذیب کے عکاس ہیں جس تہذیب کا تعلق قومی یکجہتی اور آپسی بھائی کا چارے سے رہا ہے۔

مشترکہ تہذیب یعنی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں قرۃ العین حیدر نے مشترکہ کردار جو اُن کے ناولٹوں میں ہیں ان سے بھی ظاہر ہے ۔ان کے ناولٹوں میں کسی ایک فرقہ کسی ایک مذہب کے کردار نہ ہوکر بلکہ تمام مذاہب اور تمام فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں مثلاً۔منو ، کندن، سید شجاعت حسین ، گلنار سیتا،جمیل ، کامران ، زرینہ ،صنوبر، راحت، ارسلان رام نندن، ترلوچن، رام کرن، پاربتی ،جمیلن ، ورما صاحب رشک قمرن

وغیرہ وغیرہ جو کردار ان کے ناولٹوں میں ہیں وہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اپنے اندر سمٹے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے ادب میں جب بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے حوالے سے بات ہوگی قرۃ العین حیدر کی ان تخلیقات کا ضرور ان میں نام ہوگا۔

حواشی

۱۔ ادبی تخلیق اور ناول ص ۱۳۶، ۱۳۷

۲۔ ایضاً ص ۵۹۔۵۸

۳۔ ایضاً ص ۶۳

۴۔ ایضاً ص ۶۴

۵۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص ۲۵۹

۶۔ اردو میں ناولٹ نگاری۔ ڈاکٹر صبا عارف۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤ، دہلی ۶۶

۷۔ ستیاہرن۔قرۃ العین حیدر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ،ص ۹۲

۸۔ آرٹس فیکلٹی جرنل علی گڑھ۔ پروفیسر صغیر افراہیم۔ ۱۶۷

۹۔ ستیاہرن ۔قرۃ العین حیدر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۶۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۸، ۷۹

۱۵۔ چار ناولٹ، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ، ص ۱۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۰

۲۰) چار ناولٹ، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل علی گڑھ۔ ص ۲۴۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۵۲

باب سوم

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں
قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

ہمارے ہاں اردو ادب میں افسانے کی تاریخ کوئی زیادہ لمبی نہیں بلکہ سوسوا سو سال کے مختصر عرصہ تک ہی محدود ہے۔ پریم چند کو اردو افسانے کا موجد کہا جاتا ہے حالانکہ جدید تحقیق راشد الخیری کو بتارہی ہے لیکن اس میں بھی کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ دو چار سال کا ہی فرق ہے۔ منشی پریم چند اور راشد الخیری کا دور 1857 کے بعد ہی شروع ہوتا ہے جب ہمارے ملک میں مختلف مذہبی اورسماجی اصلاح کے لئے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔ان تحریکوں کا مقصد قومی بیداری اور آزادی حاصل کرنا تھا۔ اور یہ سب تب ہی ممکن تھا جب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ان تحریکوں اوررجحانات میں موجود ہوں۔ یہ سب تحریکیں اوررجحانات 1857ء کے بعد وجود میں آنے لگے ۔ ان تحریکوں میں ملک کے بڑے بڑے ادیب اور دانشور موجود تھے جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے ۔انیسویں صدی کے آخری برسوں میں یہ تحریکیں زور پکڑنے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم بنگال کے خلاف ملک میں بہت بڑا احتجاج ہوا اور بہت سے ادیبوں قلمکاروں نے اس کے خلاف ایک زبان ہوکر آواز بلند کی ۔لوگوں کے سوے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑا۔اسی کی ایک کڑی پریم چند کا افسانہ ’’رانی سارندھا‘‘ ہے۔جس میں رانی سارندھا کا کردار ایک بہادر اور ملک کی ان پر مٹنے والی راجپوت عورت کا ہے ۔ جو ملک وطن کی آن پر مٹنے کا عزم رکھتی ہے ۔ پریم چند کے افسانوں میں جو جذبہ اورطاقت ابھر کر ہمارے سامنے آئی ہے وہ کسی ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ وہ انسانی دوستی آپسی بھائی چارے کے عناصر اس میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو مشترکہ ہندوستانی کردار ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ نہ تو ہندو ہوتے ہیں نہ مسلم اور سکھ

عیسائی بلکہ ہندوستان کی تہذیب اور ثقافت کی قدروں اور روایتوں کا علمبردار ہوتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی قوت شدت سے ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے پریم چند کے ان خیالات اور تصورات کے متعلق احمد طارق یوں رقمطراز ہیں:۔

''پریم چند کے افسانوں میں انسانی دوستی کی قدر پوری قوت سے ابھرتی ہے ۔ دراصل دنیا کی ہر اعلیٰ اورترقی یافتہ تہذیب وثقافت کی حامل قوم اورسماج میں کچھ ایسی قدریں موجود ہوتی ہیں جواس کی ترقی اورفروغ میں معاونت کرتی ہیں ۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی بنیاد ان گنت تہذیبوں اور ثقافتوں پر قائم ہے ۔ چنانچہ ایسی تہذیب اورسماج میں اس نوع کی قدریں اور سماجی اداروں کی سخت ضرورت ہے جو مختلف تہذیب وثقافت کے حامل افراد کے مابین یگانگت اور اہم آہنگی کی فضا قائم کریں۔ ہندوستانی سرزمین کی جغرافیائی خصوصیات نے یہاں کے باشندوں کو جو وسیع النظری اور کشادہ دلی کی صفات عطا کیں اس کے نتیجے میں ہندوستان میں داخل ہونے والی ہر قوم نے انسانی دوستی قائم کی ....اسی کی مثالیں پریم چند کے ہاں ملتی ہیں۔''[1]

قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی اسی روایت کو آگے چل کر پریم چند کے بعد دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنایا۔جن میں ترقی پسند افسانہ نگار قابل ذکر ہیں ۔

پریم چند کے بعد اوربھی بہت سے افسانہ نگاروں نے اس بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھا اورآگے بڑھایا۔جس میں ترقی پسند افسانہ نگار قابل ذکر ہیں ان میں راجندرسنگھ بیدی، کرشن چندر ، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی ، احمد ندیم قاسمی، قرۃالعین حیدر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے پریم چند کی روایات کوآگے بڑھایا اور ادب برائے زندگی کے نظریے کو اپنا کر سماجی حقیقت نگاری کو اپنا مقصد بنایا۔ ان ادیبوں اور قلمکاروں نے انگریزحکومت کے خلاف اور آزادی کے حق میں اپنی آواز بلند کی۔ ان ادیبوں نے سماج میں جاری فرقہ وارانہ منافرت کوختم کرنے کی کوشش کی اور ہندومسلمان،سکھ عیسائی سبھی قوموں کوقومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ رہتے اور اتحاد واتفاق کی مثالیں پیش کیں۔ وقارعظیم ترقی پسندادیبوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ’’ترقی پسند کا سب سے پہلا ، بے حد صاف اورصریح مفہوم یہ ہے کہ وہ زندگی کا مصور اورنقاد ہو۔ ہمارے نئے افسانہ نے اس مفہوم کو بڑی اچھی طرح سمجھا ہے ......ہمارے اچھے افسانہ نگار اب ہندوستان کی زندگی کےمختلف پہلوؤں کےصحیح مصور اورترجمان بن کرادبی دنیا میں آئے ہیں۔‘‘[۲]

ہمارے ملک کے سماج میں مختلف مذہب کے لوگ آپسی میل ملاپ اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں اور ہمارے ادیب بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہاں کے آپسی بھائی چارے اورقومی یکجہتی کی مثالیں ان ادیبوں کی تخلیقات میں نظر نہ آئیں۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا تعلق ہے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ جس ماحول میں پیدا ہوئی اس ماحول میں پرورش پائی جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے رواداری کا ماحول تھا وہ ان کی تخلیقات میں نظر نہ آتا۔قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ سوسائٹی کی نمائندگی کی اور وہ اس سوسائٹی کا حصہ تھیں جس میں مشترکہ تہذیب کے عناصر جابجا موجود تھے لہٰذا جب انہوں نے ادب تخلیق کرنا شروع کیا تو ظاہر ہے کہ وہ محرکات ان کے ہاں بھی ہمیں دیکھنے کو ملے۔

قرۃ العین حیدر نے بچپن سے ہی لکھنا شروع کیا یہی وجہ ہے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1947ء میں محض وہ جب بیس اکیس سال کی تھی وجود میں آیا اور عام وخواص میں کافی مقبول ہوا اور شہرت پائی اس افسانوی مجموعہ میں چودہ افسانے چھپے۔جن میں دیوار کے درخت، پرواز کے بعد، سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا،ٹوٹتے تارے لیکن گومتی بہتی رہی، ستاروں سے آگے، آہ! اے دوست، ایں دفتر بے معنی؟ ہم لوگ رقص شرر، یہ باتیں، اودھ کی شام، مونالسا، جہاں کارواں ٹھیرا تھا وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ ابتدائی دور کے یہ افسانے رومانی افسانے زیادہ ہیں مگر ایک بات جوان افسانوں میں بھی موجود ہیں اور میرے موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے وہ ہے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر جو قرۃ العین حیدر کی ان تحریروں میں موجود ہیں خواہ وہ رومانی ہو یا نہ ہو ۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

> ''قرۃ العین حیدر کی تمام فکشن میں ہندوستان کے ثقافتی ماضی
> ہیں انہماک نیز حال سے رشتہ کا عکس ملتا ہے۔ان کی تخلیقات میں

اس معانی میں احساس شتابی ہے کہ ہندوستانی عوام کیا ہوگئے ہیں اور ان کی موجودہ شناخت میں اس تکنیکی عمل کی جھلک موجود ہے جس نے اس کی ثقافتی شناخت ابھاری ہے ۔ قرۃ العین حیدر ہندوستانی ہیں اوران کی سماجی اخلاقیات مشرقی ہیں۔ تاہم جس انسانی فطرت کی عکاسی کرتی ہیں وہ سبھی جگہ پائی جاتی ہے اورجس درد کی وہ تصویرکشی کرتی ہیں وہ عالمگیر ہے ۔ ان کی تخلیقات میں وسعت زماں ومکاں کی تمام صفات موجود ہیں اور بلاشبہ انہوں نے ہمارے درد کی منفرد فکشن عطا کیا ہے ۔''۳۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر شیفتہ پروین یوں رقمطراز ہیں:۔

''قرہ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا آغاز اس عہد میں ہوا جب بیسویں صدی کی دنیا کئی ذہنی اورسیاسی انقلاب سے گذر چکی تھی۔ پرانی بنیادوں پر قائم حقیقتیں لڑکھڑا رہی تھی۔ تخلیقی زمین نئے سوالات اورنئی ہیئت سے روشناس ہورہاتھا۔ ماضی ویرانے کا لینڈ اسکیپ بن چکا تھا اوراس میں گذشتہ زمانے کی عظمتوں کے کھنڈرات موجود تھے۔ حال میں ایک اضطراب تھاجو نہ ماضی سے کسب مسرت کرسکتا تھا اور نہ مستقبل خوش آئند تصورات کا محور بن سکتا تھا۔''۴۔

ایک اورجگہ ڈاکٹر شیفتہ پروین یوں رقمطراز ہیں:۔

''قرۃ العین حیدر کی فکر کا مرکزی محور''مشترکہ تہذیب کا تصور ہے۔ یہ ایک تصور ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس حقیقت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔۱۹۵۰ء کے بعد کے ان کے افسانوں میں فرقہ واریت کا دکھ شدت طور پر ابھرتا ہے۔ انہوں نے جاگیرداری اور تعلقہ داری کے زمانوں کی قدریں دیکھی ہیں۔ ہندو اور مسلمان اتحاد کا منظر دیکھا ہے۔لکھنؤ کی جنت نما سرزمین پر یگانگت اور محبت کے خوابوں کی تعبیریں بھی دیکھی تھیں۔1947ء آزادی کیا ملی۔ ہندوستان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ جغرافیہ ہی بدل گیا سرحدیں بدل گئیں۔ لوگوں کے درپے بدل گئے محبت نے نفرت کا روپ دھرلیا۔ باغ وبہار کی مجلس آن کی آن میں اجڑ گئیں۔ مشترکہ تہذیب جس کی آبیاری میں صدیاں لگیں تھیں۔ سیاست بازوں نے اسے ایک لمحے میں تہس نہس کر دیا۔''[1]

پروفیسر شہاب عنایت ملک قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

قرۃ العین حیدر کے تمام افسانوی مجموعے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہندوستان کے ماضی میں اپنی جڑوں کی کھوج بھی کرتی ہیں اور پیدہ شدہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی ہیں .... وہ ہر اس موضوع کو اپنے افسانے کی بنیاد پر بتاتی جاتی ہیں انہیں حادثات وتجربات کسی

شکل میں کائنات سے ملتا ہے۔ وہ اگر رومان پسند ہیں تو ترقی پسند
بھی ہیں وہ قدیم روایتوں کی مزاج داں بھی ہیں اور جدید طرز فکر
وفن کی شاید بھی۔ تقسیم ملک کے تذکرے اور تقسیم کے نتائج سے
بحث بھی ان کے افسانوں کے موضوعات بنتے ہیں۔''۵

ستاروں سے آگے:

ستاروں سے آگے قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جو 1947ء میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل ۱۶۔افسانے شامل ہیں۔ان تمام افسانوں میں تقریباً رومانی رنگ غالب ہے مگر ایک بات جو ان افسانوں میں اول تا آخر تک کی ان کی تمام تخلیقات میں شامل ہے وہ ہے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر جو تمام میں موجود ہیں۔

دیودار کے درخت:

قرۃ العین حیدر کے پہلا افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ان کا ابتدائی دور کا افسانہ معلوم ہوتا ہے اس میں دہرہ دون جیسے مقام کا منظر بڑی خوبصورتی کے ساتھ کچھ اس طرح بیان کیا ہے اور افسانے کی ابتدا بھی کچھ اس انداز میں ہوتی ہے:۔

نیلے پتھروں کے درمیان سے گذرتی ہوئی جنگلی نہر کے خاموش
پانی پر پڑتے ہوئے دیوار کے سائے، بیتے دنوں کی یاد کے

دھندلکے میں کھو کے مٹتے جارہے ہیں ۔ بھیگی بھیگی سرد ہوائیں
چیڑھ کے نوکیلے پتوں میں سرسراتی ہوئی نکل جاتی ہے اور
دیوداروں کے جھنڈد کے پرے اس اونچی سی پہاڑی پر بنی ہوئی
سرخ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں پر چاند کی کرنیں پڑی
جھلملاتی رہتی ہیں۔۶ے

یہاں مصنفہ خود متکلم کے صیغے کے طور پر اپنا کردار پیش کررہی ہیں ان کے ساتھ کچھ اور کردار خالدہ ، رباب، زرین ، جاوید اور اجیت گھوش اورلور نیز و کے کردار ہیں۔ یہ لڑکیاں وہاں چھٹیاں گذارنے کے لئے گئی ہوتی ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات جاوید اوراجیت گھوش سے ہوتی ہے ۔میڈم لورنیزو وہاں ان کی پڑوسن ہوتی ہے ۔لورنیزو وہاں گٹار بجاتی ہے اور یہ لڑکیاں اس سے گٹار سیکھتی ہیں۔لڑکیوں کا کتا وہاں گم ہوجاتا ہے جب وہ اسے ڈھونڈنے جاتی ہیں تو ان کی ملاقات جاویداوراجیت سے ہوئی ہے ۔جس کو وہ اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں جاوید پیشے سے ایک ڈاکٹر ہے ۔ایک دن خالدہ کو بخار ہوتا ہے اور جاوید اُس کو دیکھنے کے لئے بھی آتا ہے اسی دوران ان لڑکیوں کو جاوید میں دلچسپی ہوتی ہے ۔سبھی جاوید کو پسند کرتیں ہیں۔ جاوید پیشے سے ایک ڈاکٹر ہے اور وہاں ملیریا اور مچھروں کی تحقیقات کرنے کے لئے آیا ہے ۔ کچھ دونوں کے بعد وہ وہاں سے واپس چلے جاتے ہیں۔''اور دیوداروں کے سائے میں جس چھوٹے افسانے نے جنم لیا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ادھورا رہ گیا۔''

قرۃ العین حیدر کا یہ پہلا افسانہ مشترکہ تہذیب سے بھرپور ہے ۔جس افسانے میں

مشترکہ کردار جاوید، جیت گھوش، میڈم لورنیز و جیسے کردار ہوں وہاں ان کرداروں سے ظاہر ہے کہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں ملنی ظاہر ہیں۔ یہاں کے تہوار یہاں کے قومی دن منانے میں لوگ چاہتے وہ کسی بھی مذہب کے ہوں کبھی پیچھے نہیں ہٹتے جس کو افسانہ نگار نے کچھ اس طرح سے کیا ہے:

> ''اسٹارز اینڈ اسٹرائیں۔ اخروٹ کی ٹافی۔ دھن دھن دھاگے
> ترکٹ تو ناکٹ نا۔ اور ھے شنکر اور رام گوپال دھی نادھی دھینا۔ ریڈ
> کراس ویک منانے کے لئے دنگ میں جو مانک پوری ناچ ہوا تھا
> کتنا اچھا تھا۔''۸

مندرجہ بالا حوالہ سے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بہت سی باتیں ظاہر ہوتی ہیں اخروٹ کی ٹافی سے یہاں کی تہذیب یہاں کے کلچر یہاں کے کھانے یہاں کی میٹھائیاں ظاہر کرتی ہے کہ یہاں کے لوگ کس قسم کی ٹافیاں بناتے تھے ۔ جو کہ ایک مشترکہ چیز ہے اودھے شنکر اور رام گوپال یہاں کے مقدس نام اور مذہبی رہنما ہیں ان کے نام کس طرح مسلمانوں کی زبان پر بھی ہیں اور ہندوسکھ عیسائی کی زبان پر بھی ۔غرض یہ کہ یہاں کے گرو،صوفی ،سنت چاہئے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں ہر خاص وعام کی زبان پر ان کا نام ہوتا ہے ۔ یہاں اجمیر شریف مسلمانوں کی زیارت ہے مگر جب ہم وہاں جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تو ہر قسم کے لوگ ہر مذہب کے لوگ موجود ہوتے ہیں یہ یہاں ہمارے ملک برصغیر ہند کی ہی روایت ہے یہاں کے صوفی سنت مشترکہ ہیں۔ یہاں کی خانقاہیں مشترکہ ہیں۔ یہاں کی تہذیب مشترکہ ہے ۔ آگے چل کر اسی پیرا

گراف میں ریڈکراس ویک منانے کی بات ہوتی۔ یہ ہمارے مذہب یا قوم کا کوتی تہوار نہیں بلکہ مغرب کی دین ہے۔ وہاں ریڈکراس ویک منایا جاتا تھا مگر انگریز جب ہمارے ہاں ہندوستان میں آتے تو یہاں کی تہذیب ہی کچھ اس طرح سے مشترکہ نہیں کہ یہاں بھی ریڈکراس ویک لوگ منانے لگے۔ یہ ہے ہماری مشترکہ تہذیب یہاں کی بھائی چارگی اور قومی یکجہتی جس کی مثالیں ہمارے ادیبوں قلمکاروں، فنکاروں نے دی ہیں اور اسی بات کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے ''دیودار کے درخت میں برتا اور پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی اور بھی کئی مثالیں پیش خدمت ہیں:

''ہمسائی میڈم لورنیزو کی ولا میں سے کبھی کبھی گٹار پر Moonlight in Havana کی بھولی بسری آواز آجاتی ہے تو دل جیسے چپکے سے ڈوب جانے کو تیار ہوجاتا ہے۔''[9]

یہ ہے ہمارے دل میں ان انگریزوں کے لئے پیار ومحبت جنہوں نے یہاں ظلم وجبر اور یہاں کی قوم کا ہرطرح سے استحصال کیا۔ اُن کے میوزک کو بھی ہم نے کیسے قبول کیا اس کی مثال بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے میں دی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے سے کچھ کم نہیں یہاں ایسی بول چال کچھ اس طرح سے ہوتی ہے:۔

''ذرا اٹھ کر سامنے والا دروازہ تو بند کرلو جان۔'' خالدہ نے کتاب پر سے نظر اٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔ ہم سب اپنے خیالوں میں اتنے کھولے ہوئے تھے کہ ہوا کی بدتمیزی پر واقعی غصہ آگیا۔

میں نے رباب کی طرف رخ کرکے بڑے پیار سے کہا۔گڈو! تم
تو دروازے کے اتنے قریب کھڑی ہو، ہاتھ بڑھا کرذرا بند کردو۔
میں یہاں سے اٹھ کے سارا کمرہ عبور کروں، کس قدر طوالت
ہوگی۔''۱۰

یہاں کی مشترکہ بول چال کی زبان جس میں قومی یکجہتی اور
آپسی بھائی چارے کے عناصر خود بخود نظر آتے ہیں کو قرۃ العین
حیدر نے اس افسانہ میں پیش کیا ہے ۔مثلاً جان ، گڈو، پیارے ،
پیارو، جناب، صاحب، کا استعمال اس افسانہ میں کرکے قرۃ العین
حیدر نے جو آپسی بھائی چارے کی مثالیں پیش کیں ہیں وہ قابل
داد ہیں۔

''دیودار کے درخت'' قرۃ العین حیدر کا ابتدائی دور کا افسانہ ہونے کی وجہ سے حالانکہ
افسانہ ہے چونکہ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں روحانی رنگ نظر آتا ہے ۔مگر ایک
بات مشترکہ تہذیب کی عکاسی انہوں نے شروع سے لیکر آخیر تک کی تمام تخلیقات میں
پیش کیں ہیں جس کے عناصر ہمیں قرۃ العین حیدر کے اس افسانہ میں بھی نظر آتے ہیں۔
آگے چل کر اس افسانے میں جو ہماری تہذیب میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی نظر
آتی ہے وہ ہے بڑوں کا احترام کرنا۔ ہمارے پرکھوں سے یہ قربت چلی آتی ہے کہ اپنے
سے بڑوں کا احترام اور عزت کی جاتی ہے ۔اس کی مثالیں بھی قرۃ العین حیدر کے اس
افسانہ میں کچھ اس طرح موجود ہیں۔

''یہ جاوید کو کل خاص طور سے کیوں مدعو کیا گیا ہے'' خالدہ عنانی اون نہ ملنے کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے پھر پوچھا۔ ہم چاروں میں وہ سب سے بڑی تھی اور امی کی عدم موجودگی میں ہمیں Chaperon کرنے کا کام اس کے سپرد تھا۔

کل ہیک مین میں وکڑی بال ہے۔ ہم اس کے ساتھ جائیں گے تم مت جانا ڈیئر ۔ زکام بڑھ جائے گا ۔ ذریں نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔ ہمیں معلوم ہے ذریں تاج بیگم امی اس چیز کو ہرگز پسند نہیں کریں گی۔ مندرجہ بالا سطور سے عیاں ہوتا ہے کہ بڑوں کی عزت واحترام کس طرح کی جاتی ہے یہ بھی آپسی بھائی چارگی کی مثال ہے جو قرۃ العین حیدر کے ہاں تخلیقات میں ملتی ہے اس افسانے میں بھی موجود ہے۔

ٹوٹتے تارے:

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ کہانی کی فضا اس طرح بدلتی ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہانی کی ابتداء ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے جیسے کہ شعر کی آمد ہو مثلاً اس افسانے میں ابتداء کچھ اس طرح سے ہوئی ہے:۔

''انجیر اور زیتون کے درختوں اور ستارہ سحری کے پھولوں سے گھی ہوئی کسی جھیل کے خاموش اور پرسکون پانیوں میں زور سے

ایک پتھر پھینکنے سے لہروں کا لحظہ یہ پھیلتا ہوا ایک دائرہ سا بن جاتا ہے نا! یا جب کوئی تھکا ہارا مطرب رات کے پچھلے پہر اپنے رباب پر ایک آخری مضراب لگا کر ساز کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اوراس کے نقرائی تاروں میں لرزتا، دم توڑتا ہوا آخری نغمہ بلند ہوتا ہے یا پھر جیسے سفید یاسمین کی معصوم کلیوں کی مہک کی تیز لپٹوں میں ملفوف ہوا کا ایک جھونکا صبح ہوتے چپکے سے اندر داخل ہوکر شمع کو بجھا دیتا ہے اور پھراس بجھی ہوئی شمع میں سے جو ہلکا سا غمگین سا دھواں لہراتا ہوا اوپر کو اٹھتا ہے نا......''[11]

قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے ''ٹوٹتے تارے'' میں انسانی زندگی میں ہونے والے غیر متوقع واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ دوسری جنگ عظیم میں مارے جانے والے لوگوں کے بارے میں اس افسانے میں بتایا ہے ۔ انسانی زندگی کے خواب کیا ہوتے ہیں اور ہوتا کیاہے اس کو اس کہانی میں پیش کیا ہے ۔ فوجی ، پائلٹ اوردوسرے انسان جو اس دوسری جنگ عظیم میں مارے گئے ان کے ارمان کیا تھے ان کی زندگی کی کیا خواہش تھی اورکس طرح وہ پوری تو نہیں ہوتی مگر ان کو اس جنگ میں قربانی (انسانی قربانی) دینی پڑی۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے ''ٹوٹتے تارے'' میں اپنی زندگی کے تحریروں اور احساساتوں کو اس کہانی کی شکل دی ہے ۔ اس کہانی کے اہم کرداروں میں شاہینہ ، رخشندہ ، ڈاکٹر عارف اوراسلم ہیں۔ یہ سب کردار بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ساتھ

پلے بڑھے اور جوان ہوئے ۔ ان سب لوگوں کی خوشیاں اورغم مشترکہ ہیں۔ آپسی بھائی چارے کی لامثال دوستی ان لوگوں میں ہوتی ہے مگر جب کروٹ بدلتی ہے تو جنگ میں ایک دوسرے کو موت کی گھاٹ اتار دینے کو انسان ہی تعینات ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں فوجی ایک دوسرے کو موت کی گھاٹ اتار رہے تھے ۔ اپنے گھروں میں درد بے چینی کی زندگی بسر کرتے ہیں جس کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے:۔

''اپنے گھر سے ہزاروں میل دور پڑے ہوئے امریکن اور آسٹریلین فوجی ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ہر وقت چیخ چیخ کر گاتے رہتے ہیں ۔ انسان اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنے کا کتنا شوقین ہے۔''۱۲

قرۃ العین حیدر کے اس افسانے ٹوٹتے تارے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں اس افسانے کے ابتدا میں ایسی دوستی کا منظر قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:۔

''لیکن ٹھہریئے بھئی۔ اس قدر شاعری کی ضرورت نہیں ۔ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ ایسی ہی کچھ ناقابل اطمینان ، ناقابل تشریح سی کیفیت اس وقت شاہینہ پر چھائے جارہی تھی بلکہ حاوی ہورہی تھی۔ اسے محسوس ہورہا تھا، نہ جانے کیا کیا محسوس ہورہا تھا۔ کیونکہ ہماری اس احمق دنیا میں بہت سی باتیں ایسی عجیب سی ہوجاتی ہیں۔ جن کی تشریح نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی ان کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں

آتی ہے۔''[13]

مندرجہ بالاسطور میں جو پہلی سطور ہے وہ یہاں ہماری تہذیب میں بھائی چارے کی اپنی مثال آپ ہے ۔ اس کہانی میں ڈاکٹر اسلم کی زبان شاہینہ اوررخشندہ کی آپسی بات چیت بھی مشترکہ تہذیب کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

یہاں کے جو مشترکہ تہذیب ہمارے ملک میں رہی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی بھی مذہب ،مسلک ،قوم کا ہواسے انسانی رشتے ناطے سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے ۔ یہ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں بھی پیش کیا ہے جب وہ فوج کی بات کرتے ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں لڑرہے تھے وہ آسٹریلین ہو یا امریکن یا جرمن ہوں ان کی عکاسی ان الفاظ میں قرۃ العین حیدر نے کی ہے :۔

''کرسمس آنے والا ہےاورنہایت سرگرمی سے اس کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔کاغذی ربن اوررنگین جاپانی قندیلیں، مصنوعی مسکراہٹیں اورلالہ کے پھولوں سے بھرے ہوئے گلدان۔ کینٹین میں رات گئے تک گیتوں اور قہقہوں کا شور رہتاہے ۔ اپنے گھر سے ہزاروں میل دور پڑے ہوئے امریکن اورآسٹریلین فوجی ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وقت چیخ چیخ کر گاتے رہتے ہیں ۔ انسان اپنے آپ کوخود فریبی میں مبتلا رکھنے کا کتنا شوقین ہے۔''[14]

ستاروں سے آگے:

ستاروں سے آگے قرۃ العین حیدر کا اس افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' کا اہم افسانہ ہے ۔ اسی افسانے کی مناسبت سے قرۃ العین حیدر نے اس مجموعہ کا نام ''ستاروں سے آگے'' رکھا۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے کمیونسٹ طالب علموں کی بات چیت کو موضوع بتا کر یہ افسانہ ترتیب دیا ہے۔

اس افسانے کے کرداروں میں کرتار سنگھ ،حمیدہ، صبیح الدین ، جتندر، منظور وغیرہ اہم کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ستاروں سے آگے میں قرۃ العین حیدر نے گاؤں کی زندگی کی مشکلات کا تجزیہ کیا ہے ۔ اس افسانے کے کردار اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کمیونسٹ خیالات کے ہوگئے ہیں۔ ایک تو جہاں اس افسانے میں کمیونسٹ خیالات کی عکاسی ہوتی ہے وہی دوسری طرف اس افسانے میں مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر بھی موجود ہیں۔ جہاں مشترکہ کردار ہوں وہاں ظاہر سی بات ہے کہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اس طرح ملیں گئے :

''حمیدہ اپنی سرخ کنارے والی ساری کے آنچل کو شانوں کے گرد بہت احتیاط سے لپیٹ کر ذرا اور اوپر کو ہو کے بیٹھ گئی جیسے کامریڈ کرتار کے ماہیا کو بے حد دلچسپی سے سن رہی ہے ۔ لیکن نہ معلوم کیسی الٹی پلٹی الجھی الجھی بے تکی باتیں اس وقت اس کے دماغ میں گھسی آ رہی تھیں۔ وہ ''جاگ سوز عشق جاگ'' والا بیچارہ

ریکارڈ شکنتلا نے توڑ دیا تھا۔''۱۵؎

مندرجہ بالا سطور میں حمیدہ کتنی بے باکی سے یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ کرتار سنگھ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی ہے حالانکہ وہ کرتار سنگھ کو نہیں سن رہی تھی مگر یہاں کی تہذیب اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس پر ظاہر ہونے دیتی کہ وہ اس کو نہیں سن رہی حالانکہ مغربی ممالک میں ایسا نہیں ہوتا وہاں اگر کوئی چیز دلچسپ نہیں ہے تو دوسرا اس کو صاف کر دیا ہے کہ اس میں یہ خامی ہے یہ خوبی ہے یہاں کی بھائی چارے کی یہ مثال ہے کہ خوبی کو تو بڑی بے باکی سے بتا دیتے ہیں اور خامی کی پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں ۔ یہ ہماری قوم کی یکجہتی ہی ہے جو اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ حالانکہ حمیدہ دل میں کرتار سنگھ کو ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی ظاہر نہ ہو اس کے لئے وہ موضوع تبدیل کر دیتی ہے:

''لیکن یہ ریکارڈوں کا کیا فلسفہ ہے آخر؟ حمیدہ کو ہنسی آ گئی ۔
اس نے جلدی سے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ یہ سمجھ لے کہ
وہ اس کے گانے پر ہنس رہی ہے۔''۱۶؎

کامریڈ پنجابی زبان میں گھانا گھا رہا ہے۔''وس وس وے ڈھولنا'' ہماری ہندوستانی قوم کی یہی پہچان ہے کہ ہماری قوم تمام زبانوں کو یکساں اہمیت دیتی ہیں اور ایک دوسرے کی زبان کو سمجھتے اور بولتے بھی ہیں یہ ہمیں اسی ہندوستانی قوم میں ہی ملے گا اور یہی آپسی بھائی چارے کے عناصر ہیں جو قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں موجود ہیں۔

''آہ! اے دوست'':

''آہ! اے دوست'' قرۃ العین حیدر کا اس افسانوی مجموعہ میں بہت ہی کامیاب افسانہ ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف مسائل ہوتے ہیں ان مسائل کا حل تو بہت مشکل ہوتا ہے مگر رقص اور زیادہ کی خواہش ان مسائل کو بھلانے کا آسان طریقہ اس افسانہ میں نظر آتا ہے۔ مثلاً:

''غم روزگار کو بھلانے کیلئے آؤ اورنج اسکویش پئیں''

ایک دو۔ ایک دو۔ تال کہروا۔ جمنا کنارے راما، جمنا کنارے راما چین سر رنگ بالا۔
''زندگی آپ کے لئے جل ترنگ ہے۔''

مندرجہ بالا سب ایسے جملے ہیں جو فلسفے سے کم نہیں۔ انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ فلسفانہ انداز میں اس افسانے میں زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے افسانے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں بھی اس افسانے میں ملتی ہیں۔ مثلاً

''کاش کہ اپنے دیش واپس جاسکتے۔ پر کوئی فکر نہیں ناچے جاؤ سر رنگ بالا۔ دادا اور املا دیوی اگر ہندوستان کے بجائے دوس یا امریکہ میں پیدا ہوگئے ہوتے تو کیا ہوتا؟ ۱۷؎
مہادیو جی آپ نے ہندوستان کی مشرقی سرزمین میں جنم لیا ہے اسی لئے ایسے شاعرانہ طریقے سے سوچتے ہو۔ آپ برہم پتر

کی وادیوں کے لوگ ہر معمولی سے معمولی بات کو لطافت اور خوبصورتی سے ادا کرنے کے قائل ہیں۔[۱۸]

ہائے یو پی۔ میرا اپنا پیارا یو پی۔ تم نے کبھی یو پی کی گرمیاں نہیں دیکھی آم کے باغوں میں دوپہرے کے سناٹے کی خاموشی موسیقی کا بوجھ محسوس نہیں کیا۔ امرود ں کی جھرمٹ میں سے بلند ہوتی ہوئی برہا اور آلہا اودل کی تانیں نہیں سنیں۔ شاید کبھی ملیح آباد جا کر آم بھی نہیں کھائے۔ اور گومتی کے خربوز۔ آہ میرا اودھ۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں اندر سبھا ہو رہی ہے۔"[۱۹]

اپنے ملک کے چپے چپے کی تعریف قرۃ العین حیدر نے اس افسانہ بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ مختلف جگہوں کے مختلف خصوصیات گنائی ہیں۔ ہر اس علاقے کی تعریف اسی کی خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ۔ ملک کی تعریف یہاں کے لوگوں کی بھائی چارگی کو قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں بڑی بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں کی انیکتا میں ایکتا کو بڑی مہارت کے ساتھ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔

اودھ کی شام:

اودھ کی تہذیب ہو اور اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بات نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ اس مشترکہ تہذیب سے بھرا پڑا ہے جس

میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی عناصر ہیں۔ مثلاً افسانے کا آغاز ہی ہندوستانی تہذیب کے ساتھ کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے:

> ''عجیب .... بے حد عجیب۔ تم تو میرے ساتھ نہیں ناچوگی............نہیں۔ کیونکہ تم انگریز ہو۔ اوراعلیٰ خاندانوں کی ہندوستانی لڑکیوں کا فوجیوں اورخصوصاً امریکن اور انگریز فوجیوں کے ساتھ رقص کرنا بڑی ویسی بات ہے اور جو دیوزاد سافوجی پچھلے آدھ گھنٹہ سے برابر تمہارے ساتھ لڑھک رہاہے وہ توہندوستانی ہے اور میرے چچا کا دوست ہے ۔تم ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی محبت ہے ۔ اورکیا ہئی ۔ ارے جم تم تو انگریز ہو ۔فرنگی...... سفید فام، چقندر یاشلجم۔'' [۲۰]

ہماری قدیم تہذیب میں یہ بات موجود ہے کہ غیر مرد کے ساتھ عورت نہیں ناچ سکتی ۔ حالانکہ اب یہ سب باتیں پرانی ہوتی جارہی ہیں نئ تہذیب جنم لے رہی ہے مگر قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں یہ سب بھائی چارگی موجود ہے کہ آپس میں ہندوستانی ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں وہ چاہے کسی بھی مذہب کا ہومگر ایک دوسرے کے لئے ہمارے دل میں انس موجود ہوتی ہے اور وہی بات اس افسانے میں بھی موجود ہے ۔ جب جج یہ کہتا ہے کہ تم ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی محبت ہے ۔

آگے اس افسانے میں اپنے ہندوستانی فلسفہ کو بھی بتایا ہے کہ ہمارا اپنا فلسفہ ہے جو بہت ہی بہترین ہے ۔اور دوسری قوموں سے مختلف بھی:۔

''ہمارا فلسفہ بھی انوکھا ہے جیسے ہم Conusionism کا فلسفہ کہتے ہیں۔ جو بہترین ہے اور انتہائی مفید ہے ۔ زندگی جس طرح بھی سامنے آئے اسے اپنا لو ۔نرالہ فلسفہ ہے نا۔''[۲۱]

جلا وطن:

جلاوطن قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری میں اہم مقام کا حامل افسانہ ہے۔ یوں تو تقسیم ہند پر بہت سے افسانے لکھے گئے اس کے علاوہ شاعری میں بھی بہت کچھ تقسیم ہند پر لکھا گیا ۔ ایک تہذیب کے دو حصے بنے ۔ انسان انسان سے جدا ہوا۔ ایک قوم تقسیم ہوتی ۔ یہاں کی بھائی چارگی کو ٹھیس پہنچی ۔ انسان انسان کا دشمن بن گیا ۔ لاکھوں انسان بے گھر ہوگئے ۔ انسانیت کا قتل عام ہوا ۔ اسی تقسیم کو ہمارے ادیبوں نے موضوع بنا کر بہت سے افسانے لکھے۔ جن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہم وحشی ہیں، شکستہ کنگوالے وغیرہ وغیرہ کافی افسانہ لکھے گئے ان ہی افسانوں میں ایک افسانہ ''جلا وطن'' قرۃ العین حیدر کا ہے جس میں انہوں نے تقسیم کے المیہ کی عکاسی کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح جب تقسیم ہوتی تو یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی دھجیاں اڑائی گئی۔

اسی تقسیم کو موضوع بنا کر قرۃ العین حیدر نے''جلا وطن'' جیسا شاہکار افسانہ لکھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تقسیم سے پہلے یہاں کے لوگوں میں کس طرح کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی تھی اور تقسیم کے وقت کس طرح اس بھائی چارگی کی دھجیاں اڑھائی گئی۔ جس کی مثالیں کچھ اس طرح سے اس افسانے جلا وطن میں بتائی ہیں:۔

''چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی انہماک سے چاول صاف
کررہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے مگوں والی سنسان
گلی میں گونجا کی ۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے
کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

''بندگی .... بندگی............ ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے
پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

راجی کھسی ہو بھین صاحب ۔''رام رکھی نے اخلاقاً دریافت
کیا۔''۲۲؎

مندرجہ بالا سطور میں بتایا گیاہے کہ آفتاب رائے حالانکہ ایک بڑے عہدے کادرجہ دیتے ہیں۔مگر رام رکھی کو بندگی بولنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اوراس کو اپنی بہن کا درجہ دیتے ہیں یہی باتیں یہاں ہماری تہذیب میں پائی جاتی ہیں کہ چھوٹے بڑے کو احتراماً واخلاقاً اداب والقاب سے بلایا جاتاہے۔

آگے اس افسانے میں بتایا گیاہے کہ محرم کے مہینے میں کس طرح سب ہندومسلم سبھی سوگ مناتے ہیں۔ اکٹھے بیٹھ کر رات کو مرثیہ پڑھتے ہیں ۔ بیان ایک دوسرے کوسناتے ہیں۔اور یہ سب باتیں وہ اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں جن کوقرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیاہے:۔

''رونا بہر حال فرض تھا۔خواہ چھمو بیگم جیسی کٹی ہی بیان کیوں
نہ پڑھے۔ لہٰذا بوا مدن دیوار کے سہارے بیٹھی مشہدی رومال سے

منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی
بیٹھی اونگھ رہی تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری
آئے۔''۲۳

محرم مسلمانوں کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں کربلا کا واقعہ پیش آیا تھا۔اس کے بعد ہر سال مسلمان اس مہینے میں جلسے جلوس وغیرہ نکالتے ہیں اور مرثیہ خوانی بھی کرتے ہیں ہمارے اردو ادب میں تو اس واقعہ کے تعلق سے الگ ایک صنف اسی واقعہ کربلا سے منسلک بھی ہے ۔ ویسے ہے تو یہ مسلمان کا مہینہ مگر قرۃ العین حیدر نے آپسی بھائی چارگی کو پیش کرنے کے لئے اس کا ذکر بھی اس طرح سے کیا ہے کہ بوا مدن جو کہ ایک ہندو عورت ہے وہ بھی مرثیہ خوانی کرتی ہے اور روتی و بین کرتی ہے ۔غرض یہ کہ محرم کے مہینے میں مسلمانوں کے دکھ کے ساتھ یہاں کے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔

جب ہمارا ملک تقسیم ہوا تو یہاں کے بھائی چارے کی روایت کو ایک بہت بڑا دھچکا لگا۔ جو لوگ دل کے بڑے پکے مسلمان تھے اور چاہتے بھی تھے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک بنے وہ بھی ایک دکھ کو چھپا نہ پائے جس کی ترجمانی قرۃ العین حیدر کچھ یوں کرتی ہیں:۔

''کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔لیکن دل کے
بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے ۔ جب کانگریسی وزارت قائم
ہوتی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔حافظ ابراہیم

ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کر ان سے لپٹ گئے ۔
جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفیٰ دیا اور مسلم لیگ
نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔''۲۴؎

یہاں اس افسانے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی جو مثالیں قرۃ العین حیدر نے پیش کیں ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، بھائی چارگی ، محبت ، خلوص احساس کو یہاں کی تہذیب میں ہے وہ کہیں اور ہمیں نہیں ملے گا کچھ اور مثالیں پیش خدمت ہیں جو یہاں کی تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی گواہ ہیں:

''برسوں سے جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں۔ تو وہ
ہوئیں۔ رخصت ہوکر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک
چلن قائم تھا۔جس میں شادی بیاہ تیج تہوار ،لڑائی جھگڑے ،محرم
،کونڈے، جوگی دمپورے کی سالانہ زیارت ،غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت
اپنی جگہ مسلم تھی۔''۲۵؎

''وسط شہر میں مہاجروں، ساہوکاروں ارو زمینداروں کی اونچی
حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ
دیتے۔ اسکول کھلواتے ۔ مجرے اور مشاعرے دنگل کرواتے ۔
جلسے جلوس اور سر پھٹول بھی انہیں کی سرپرستی میں منعقد ہوتے ۔
ہندو مسلمان کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار ۔ میلے ٹھیلے ۔

محرم بالے میاں کی برات پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے
بازیاں ۔ موکل ، گواہ پیشکار ، سمن عدالتیں صاحب لوگوں کے لئے
ڈالیاں ۔''۲۶

''ہندو اور مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔
خصوصاً دیہات اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساڑیاں اور
ڈھیلے پائجامے پہنیں۔ اودھ کی بہت پرانے خاندانوں میں بیگمات
اب تک لہنگے بھی پہنیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان
دونوں ساڑی کے بجائے کھڑے پائجوں کا پائجامہ پہنتیں۔
ہندوؤں کے ہاں اسے ''اجاڑ کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ
تھی ۔ پولیس کا عملہ اسی فیصد مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی
ہی کمی تھی ۔''۲۷

مندرجہ بالا مثالوں سے واقع ہوتا ہے کہ یہاں کہ مشترکہ کلچر میں قومی یکجہتی اور آپسی
بھائی چارے کی کوئی کمی نہ تھیں۔ دونوں ہندو مسلمان کا ایک جیسے تہوار تھے۔ ان تہواروں
کو منانے کا طریقہ بھی ایک ہی تھا۔ خواہ وہ محرم ہو یا پھر عید اور پھر ہولی ہو یا دیوالی دونوں
ہندو مسلم ان تہواروں کو اکٹھے مل بیٹھ کر مناتے تھے۔ رسم ورواج بھی سبھی قوموں کا یہاں
ایک تھا۔ یہاں کے کلچر یہاں ایک ثقافت اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپس
میں لڑائی جھگڑے۔ فتنے فساد ہوں قتل وغارت ہو اور یہ سلسلہ تقسیم ہند تک قائم رہا۔ مگر
جب انگریزوں نے یہاں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو والی پالیسی اپنائی تو اس کے بعد

یہاں قوم میں تصادم آرائیاں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے یہاں کوئی سماجی اور ثقافتی فرق نہیں تھا بلکہ مشترکہ کلچرل کی مثالیں پوری دنیا میں یہاں کی موجود تھیں۔ یہاں کے زبان یہاں کے گیت ایک تھے سرچاہے انیک تھے ۔ جن کی مثالیں قرۃ العین حیدر کے اس افسانے میں کچھ اس طرح سے موجود ہیں:۔

> ''زبان اور محاورے ایک ہی تھے ۔ مسلمان بچے برسات کی دعامانگنے کے لئے نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے برسو رام دھڑا کے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے ۔ گڑیوں کی بادات تو وظیفہ کہا جاتا۔ ہاتھی گھوڑا پالکی۔ جے کنہیالال کی۔ ذہنی اورنفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا لہٰذا غیر شعوری طور پر Imagery بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اورسیتا اورپنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر لاپتیں............ بھری گگری سوری ڈھرکاٹی شام............''۲۸

خواہ وہ لوگ گیت ہو یاں یا پھر بچوں کے گیت سب یہاں کی تہذیبی میراث تھے وہ میراث جو مشترکہ تھی جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر تھے اور جس کو قرۃ العین نے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ عورتیں جنہوں نے کبھی غیر مرد سے بات بھی نہیں کی تھی مگر جو گیت گاتی تھی اس میں ہندوؤں کا

ذکر ہوتا تھا جو اس بات کی دلیل اور ثبوت ہے کہ یہاں مشترکہ کلچر تھا۔اور ایک جگہ قرۃ العین حیدر آگے چل کر اس افسانے میں یوں لکھتی ہیں:۔

''یہ گیت اور کجریاں اور خیال یہ محاورے، یہ زبان ان سب کی بڑی پیاری اور دل اویز مشترک میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دہلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واقعہ تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور خوبصورت رنگ بھرے تھے۔''۲۹

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو ان سے پہلے یہاں ہندوستان میں ہندو اور بدھ مت مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے تھے ۔مسلمان اپنے ساتھ باہر کی تہذیب اور کلچر یہاں اپنے ساتھ لائے ۔ بہت سے صوفی بزرگ ان مسلمانوں کے ساتھ یہاں ہندوستان میں آئے ۔ ان صوفیاء کرام سے متاثر ہوکر بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بڑی تعداد یہاں مسلمانوں کی ہوگئی۔ یہاں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے آبا واجداد یہاں کے کلچر یہاں کی تہذیب یہاں کے رہن سہن رسم ورواج کو تو چھوڑ نہیں سکتے تھے ۔مگر باہر کے کلچر رسم ورواج کو انھوں نے ضرور اپنایا۔ اسلام مذہب کے ارکان کو انھوں نے پوری طرح ایک بار ہی نہیں بلکہ آہستہ آہستہ قبول کیا ۔ اسلام میں جو ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہوا اور پورے اسلام پر اس کا اثر رکھتا ہے وہ ہے واقعہ کربلا ۔اس واقعے سے پورا اسلام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مسلمان محرم کے مہینے میں اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں اور سوگ بھی مناتے ہیں مگر ہندوستان میں نہ

صرف مسلمان بلکہ یہاں کے دوسرے لوگ بھی مسلمانوں کے اس دکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں بین کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا کے موقعہ پر مختلف مرثیہ گایے جاتے ہیں اس گانے کی محفلوں میں جہاں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں وہیں ہمارے اس مشترکہ کلچر میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں اا س محرم کے مہینے میں خوب دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہاں نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مسلمانوں کے اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں ۔جس کی عکاسی قرۃ العین حیدر نے بڑے بے باک طریقے سے کچھ اس طرح سے پیش کی ہے:۔

''عاشور کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھ کر ...... بی مدن نے تکیہ پر کرم خورہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا............ اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا...........بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

''اے لو دونوں کی دونو ں سٹھیا گئی ہیں۔ اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں......؟ بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

توبہ توبہ کمبخت ایسی ساڑتی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یادنہیں رہتا اے لو میں تو عینک لانا بھی بھول گئی۔ اے بہن ...... اے نیازی بیگم۔ ذری اپنی عینک تو دینا۔'' بوا مدن نے طویل سانس بھر کہا کہ ۔ نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کردی جو بوا مدن نے ناک

کی پھینگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔''۳۰

بگن ہوکے مراثی یا کہ بوا مدن سب کے سب رات کو بیٹھ کر مرثیے گاتے ہیں اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں قائم کیں ہیں اور جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اس طویل افسانے جلاوطن میں بھی پیش کیا ہے۔

ڈالن والا:

ڈالن والا قرۃ العین حیدر کا بہت ہی مشہور افسانہ ہے۔ جو قرۃ العین حیدر کے تیسرے افسانوی مجموعہ''پت جھڑ کی آواز'' میں شامل ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے میں کئی واقعات اور کہانیوں کو شامل کر کے یہ افسانہ تحریر کیا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار زبیدہ صدیقی ہے۔ یہ بہت ہی پیچیدہ کردار ہے۔ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ہے۔ زبیدہ غیر مسلم کو پسند نہیں کرتی اس کی شادی محمود صاحب سے ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں مگر آگے چل کر وہ دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ یہاں زبیدہ ٹوٹ سی جاتی ہے اور ایک ہندو پروفیسر ڈاکٹر انیل دت سے یہ بھی دوسری شادی کر لیتی ہے۔ اس بات کی اطلاع وہ باقی پریوار کے لوگوں کو ایک خط لکھ کر کچھ یوں بتاتی ہے۔

> ''ایک روز ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا خط باجی کے نام کلکتے سے آیا
> ۔ انہوں نے لکھا تھا۔جس روز میں یہاں پہنچی اسی ہفتے میں محمود
> صاحب نے میری بھتیجی سائرہ سے شادی کر لی ۔ بڑی دھوم کی

شادی ہوئی ہے تم نے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں دولہا دلہن کی
تصویر بھی دیکھی ہوگی۔

پی۔ ایس: میں نے اب اللہ میاں کے خلاف اسٹرائک کر دیا ہے اور پرسوں میں نے بھی ڈاکٹر اُپل سے سول میرج کر لی۔ ڈاکٹر اُپل بردوان کالج میں پڑھاتے ہیں۔

پی۔ پی۔ ایس۔ ڈاکٹر اُپل ہندو ہیں۔

یہ اطلاع کہ میں نے ایک کافر سے شادی کر لی مسز فاروقی،
مسز قریشی اور مسز انصاری کو بھی دے دینا۔[۳۱]

دعا گو

زبیدہ اُپل

افسانے ''ڈالن والا'' میں زبیدہ صدیقی کی زندگی کو قرۃ العین حیدر نے نفسیاتی طور پر پیش کیا ہے۔ زبیدہ صدیقی کے علاوہ زہرہ ڈوبی سرکس میں کام کرتی ہے۔ سرکس میں وہ موت کے کنویں میں کام کرتی ہے اور پیسے کماتی ہے۔ زندگی اور موت کے اس کھیل میں وہ موت کی پرواہ کئے بغیر پیسوں کو اہمیت دیتی ہے۔ حالانکہ اس کھیل میں جدو جہد کرتے ہوئے ایک دن وہ حادثہ کا شکار ہوجاتی ہے اور اس کی ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے ''ڈالن والا'' میں پانچ کردار ایسے پیش کئے ہیں جن کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے ڈالن والا میں کرداروں کے ذریعے انسانی جذبات اور احساسات کی الجھنوں کو بڑی سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس افسانہ ''ڈالن والا'' میں تمام طرح کے لوگ موجود ہیں۔ غریب، امیر، اچھے بڑے اور اپنی اپنی خوبی اور خامی کا احساس کرواتے ہیں۔ مگر ایک بات جو سب کرداروں خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں موجود ہے وہ ہے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر۔ اس افسانے میں ڈالن والے میں انگریز بھی ہیں ہندوستانی بھی ہیں مگر آپسی بھائی چارے کو اس طرح قائم رکھے ہوتے ہیں کہ اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ الگ الگ قوم اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں جو ہمارے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے موجود نہیں تھی مگر جب ہندوستان میں انگریز آئے تو انہوں نے وہاں کی تہذیب وہاں کا کلچر اپنے ساتھ لائے۔ یہاں کے لوگوں نے اس تہذیب اس کلچر کو اپنایا۔ انگریزوں سے پہلے ہمارے یہاں ہندوستان میں عورتوں کا گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر جب ہندوستان میں انگریز آئے تو وہاں کی تہذیب اپنے ساتھ لائے ان کے کلچر میں عورت ناچ سکتی تھی گا سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ ہماری تہذیب میں اس تہذیب کے اثر کو قبول کیا اور رفتہ رفتہ وہ چیزیں جو یہاں معیوب سمجھی جاتی تھیں ہونے لگی جس کی مثال کچھ یوں ہے:

> ''جب سے پڑوس میں مسز جوگ مایا چٹرجی کلکتے سے ان کر رہی تھیں اس محلے کے باسیوں کو سخت احساس ہوا تھا کہ ان کی زندگیوں میں کلچر کی بہت کمی ہے۔ موسیقی کی حد تک ان سب کے ''گول کمروں'' میں ایک ایک گراموفون رکھا تھا۔ ابھی ریڈیو عام نہیں ہوئے تھے۔ فریجڈیر Status Symbol نہیں بنا تھا۔ ٹیپ

ریکارڈ ایجاد نہیں ہوئے تھے ۔مگر جب مسز جوگ مایا چٹر جی کے
وہاں صبح شام ہارمونیم کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو سروے آف
انڈیا کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز گوسوامی نے محکمہ جنگلات کے اعلیٰ
افسر کی بیوی مسز فاروقی سے کہا۔ بہن جی ہم لوگ تو بہت یہ بیک
ورڈ رہ گئے ۔ ان بنگالیوں کو دیکھے ، ہر چیز میں آگے آگے
............''۳۲

''ہم مسلمانوں میں تو گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے مگر آج کل
زمانہ دوسرا ہے ۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے ۔ میں اپنی حمیدہ کو
ہارمونیم ضرور سکھاؤں گی۔مسز فاروقی نے جواب دیا۔''۳۳

انگریز ہندوستان میں حکومت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ تجارت کی غرض سے آئے
تھے۔ جب انہوں نے یہاں کے کمزور حکمرانوں کو دیکھااور پرکھا تو انہوں نے آہستہ
آہستہ یہاں اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے اور حکمران بن بیٹھے ۔ یہاں کے لوگوں کو
غلام بنایا۔مگر یہاں کے لوگوں اور وہاں کے لوگوں میں یہاں کی تہذیب مشترکہ ہوگئیں۔
اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ وہاں کے لوگ یعنی انگریز یہاں ایک مقامی بولیاں سیکھنے
لگے یہاں کے کلچر سے متاثر ہونے یہاں کی تہذیب سے متاثر ہوئے۔لوگوں کے ساتھ
اٹھنے بیٹھے لگے ۔ اس افسانے میں انگریزوں کے کردار بھی ہیں جو یہاں کے لوگوں کے
ساتھ گھل مل گئے تھے ۔جن کی مثالیں کچھ اس طرح سے ہیں:

''ایک دن صبح کے وقت مسٹر جارج بیکٹ پاڈ پر نمودار ہوئے

اور ذرا جھجکتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنی طرف بلایا۔

''ریم کی طبیعت اب کیسی ہے؟ انہوں نے دریافت کیا۔ مجھے مسٹر ساغن نے بتایا تھا کہ وہ بہت زخمی ہوگئی تھی۔''

مسٹر جارج بیکٹ نے پہلی بار اس محلے میں کسی سے بات کی تھی۔ میں نے ریشم کی خیرت دریافت کرنے کے لئے ان کا شکر یہ ادا کیا۔ اور وہ اپنے چار خانہ کوٹ کی پھٹی ہوئی جیبوں میں انگوٹھے ٹھونس کر آگے چلے گئے۔۴۳

انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت تھی۔ لوگ ان سے تنگ آ گئے تھے آزادی کے لئے لڑ رہے تھے مگر وہ انفرادی بات نہیں تھی۔ اس لئے جہاں لوگ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے وہاں انفرادی طور پر انگریز بھی اتنے بُرے نہیں تھے بلکہ لوگوں کے ساتھ گھلے ملے ہوتے۔ یہاں مسٹر سائمن اور مسٹر جارج بیکٹ اس بات کی مثالیں ہیں کہ کس طرح آپسی بھائی چارے کے ساتھ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ کس طرح یہاں کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ اور یہاں کے لوگ بھی کس طرح انگریزوں کے ساتھ بھائی چارگی بنائی ہوتی تھی۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ کرسمس کی چھٹیاں یہاں انگریزوں کی آمد کے ساتھ شروع ہوتی تھی اور آج تک جاری ہیں یہاں کے کچھ لوگوں نے عیسائیت بھی قبول کر لی تھی مگر ان کے ساتھ بھائی چارگی اب تک یہاں قائم ہے اس کی مثالیں بھی قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں ہمیں کچھ اس طرح سے ملتی ہیں:۔

''کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک

> لمبی اور دبلی پتلی بی بی ہمارے ہاں مہمان آئیں۔ ان کا نام ڈاکٹر زبیدہ صدیقی تھا۔ وہ دہلی سے کلکتہ جارہی تھیں اور ایک ہفتہ کے لئے ہمارے ہاں ٹھہری تھیں۔ انہوں نے ولایت سے سائنس کے مضمون میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔۳۵؎

قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی اور مثالیں کیا ہوں گی کہ جس ملک میں کرسمس، ہولی، عید، بیساکھی، یوم عاشورہ، دیوالی وغیرہ تہوار بڑے دھوم دھام سے منائے جاتے ہوں۔ اور سبھی مذاہب کے لوگ ان تہواروں میں شریک ہوتے ہوں۔ یہ صرف ہمارے ہندوستان میں ہوتا ہے اور بڑی دھوم سے ہوتا ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں یہ سب مثالیں موجود ہیں۔ جہاں ہولی دیپاولی ،کرسمس، بیساکھی سب تہوار منائے جاتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں اور اسی بات کو قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کہتے ہیں۔ یہاں کے بچے بڑوں کا احترام حد سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ وہ تہوار ہو یا تہوار کے بغیر یہاں کے بزرگ بچوں سے حد درجے کی شغف رکھتے ہیں جن کی مثالیں قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں ملتی ہیں اور اس افسانے ''ڈالن والا'' میں بھی بچوں کا بڑے کا تیئں یہ احترام کچھ یوں قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے:

> ''لیکن بچے بہت رحم دل ہوتے ہیں۔ ڈالن والے کے سارے ہندوستانی بچے مسٹر جارج بیکٹ کو نہ صرف پلپلی صاحب کہتے تھے بلکہ کملا اور دھلا کے بڑے بھائی سورن جو ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا اور ڈون پبلک اسول میں پڑھتا تھا۔ مسٹر بیکٹ کی

لڑائی ڈائنا کو چڑانے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی۔۳۶؎

مندرجہ بالا باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ یہاں انہوں نے کسی مذہب کے بچے نہیں بلکہ ہندوستانی بچے کہا ہے جو کہ ایک خاص بات ہے کہ ملک کے لئے انہیں مذہب سے زیادہ عقیدت تھی۔ جو ان کی تخلیقات سے عیاں ہوتا ہے یہی بات ہے کہ قرۃ العین حیدر نے یہاں بچوں کو کسی مذہب سے جوڑنے کے بجائے ہندوستانی بچے کہا ہے۔

قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی اور ایک مثال اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے بات چیت کے ذریعے بتائی ہے۔ جہاں ڈالن والا میں لوگ اکٹھے بیٹھ کر بات چیت کرتے اور تبادلہ خیال کرتے تھے۔جس کو قرۃ العین حیدر نے یوں بیان کیا ہے:۔

''ڈالن والا کی ایک کوٹھی میں''انگلش اسٹور تھا جسکا مالک ایک پارسی تھا۔ محلے کی ساری انگریز اور نیٹو بیویاں یہاں آ کر خریداری کرتی تھیں اور اسکنڈل اور خبروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتی تھیں۔''۳۷؎

قرۃ العین حیدر کے اس افسانے ڈالن والا میں قرۃ العین حیدر نے ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی مذاہب کے لوگ ایک ساتھ مل جل کر رہتے اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ کچھ اس طرح رکھتے ہیں:

''شام کو میں نے وملا سے کہا۔''یہ زبیدہ آپا ہر وقت جنے اتنی

پریشان کیوں نظر آتی ہیں۔''

مجھے معلوم ہے ۔ وملا نے جواب دیا۔ وہ مجھ سے ذرا بڑا تھی۔ اور ایک ماہر فن ڈیٹکیٹو تھی۔ کل صبح آنٹی فاروقی آنٹی گوسوامی کو انگلش اسٹورز میں بتا رہی تھیں کہ ایک سائنٹسٹ ہیں۔ ان کا نام بھی ڈاکٹر کچھ ہے ۔ مجھے یاد نہیں آرہا۔ آنٹی فاروقی نے آنٹی گوسوامی کو بتایا تو تھا۔ تو وہ کلکتہ یونیورسٹی میں زبیدہ آپا کے کلاس فلو تھے ۔

مندرجہ بالا اس افسانہ ''ڈالن والا'' کی مثالوں سے واقع ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اس افسانے میں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔

قلندر:

''قلندر'' قرۃ العین حیدر کا بہت اچھا افسانہ ہے ۔ جو ''پت جھڑ کی آواز'' مجموعے میں شامل ہے ۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر پیش کئے ہیں۔ اس افسانے میں اقبال بخت کا کردار خاص توجہ کا حامل ہے ۔ جس نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی طرف توجہ دی ہے ۔ اقبال بخت ایک ہندو کردار یا ہندو مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے ۔ اس کے گھر میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان کے نام اردو اور فارسی میں رکھے جاتے ہیں ۔ حالانکہ کچھ لوگوں کو اس بات پر سخت اعتراض ہوتا ہے مگر اقبال بخت غریبوں کی مدد کرنا آپسی بھائی چارگی قائم رکھنا اور مذہب کو انسانیت پر حاوی نہ ہونے کا عزم رکھتا ہے ۔ اقبال بخت کی زندگی اس کی طبیعت ایک قلندر کی مانند ہے اور اسی کردار کی مناسبت سے قرۃ

العین حیدر نے اس افسانے کا نام قلندر رکھا۔

صدیوں سے ہمارے ملک میں ایسے کردار موجود رہے ہیں جو ہمیشہ مذہب وملت سے ہٹ کر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اور انہیں کرداروں میں سے قرۃ العین حیدر کا ایک کردار اقبال بخت ہے۔ وہ مذہب میں یقین کم اور انسانیت میں یقین زیادہ رکھتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ اقبال جیسے کردار آپ کو اور کہیں کم مگر ہمارے ملک ہماری تہذیب میں بہت ملیں گیں جن کو وقتاً فوقتاً ہمارے ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنی اپنی تخلیقات میں جگہ دی اور آپسی بھائی چارے اور قومی یکجہتی کی مثالیں پیش کیں ہیں۔

اقبال بخت کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ غازی پور کے گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک میچ کے دوران کھلاڑیوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ کھلاڑی زخمی ہوتے ہیں اور اقبال بخت زخمی کھلاڑی کے گھر جا کر ان کی والدین کی منت سماجت کچھ اس طرح کرتا ہے:۔

> ''صاحب! آپ کے صاحب زادے ہمارے اسکول میں میچ کھیلنے آئے تھے ان کو تھوڑی سی چوٹ آئی ہے کیونکہ کھیل کھیل میں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا نام اقبال بخت ہے۔ میں ....خوش بخت کا لڑکا ہوں، جو سٹی کورٹ میں مختار ہیں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ ہمارا اسکول بند کرنے کا حکم نہ دیں اور لڑکوں پر جرمانہ بھی نہ کریں کیونکہ ایک تو ہمار امتحان ہونے والے ہیں اور دوسرے

ہمارے لڑکے بہت غریب ہیں۔''

ابا جان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وراس کی مدلل اور پر اعتماد تقریر سن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوئے ۔انھوں نے اسے بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔''۳۸؎

یہاں سے اقبال بخت کی بھائی چارگی شروع ہوتی ہے یہاں وہ نہ تو کھیل رہا تھا اور نہ ہی اس نے زخمی کیا تھا بلکہ کھلاڑیوں کے تئیں اس کی ہمدردی تھی جو وہ زخمی لڑکے کو لے کر اس کے گھر تک گیا اوراس کے والد کی منت سماجت کرنے لگا کہ اس لڑکے کے زخمی ہونے پر کوئی ردعمل نہ کیا جائے ۔ اس کے بعد اقبال بخت ہمیشہ منی کے گھر آتے اوراس کو پیار سے منی بلاتے حالانکہ منی کو اس نام سے شروع شروع میں چڑھ بھی ہوتی مگر آہستہ آہستہ اقبال سے منی کی دوستی بھی ہوگئی۔ حالانکہ اقبال ایک غیر مسلم نو جوان ہے مگر یہاں قرۃ العین حیدر نے اقبال بخت کے کردار کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس سے کسی بھی مسلم کو کبھی نفرت نہیں ہوتی بلکہ ایک اچھا انسان ہی سب کے لئے ثابت کیا ۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے 'قلندر' میں قومی یکجہتی کی ایک مثال منی کے گھر میں جب سب اکٹھے بیٹھتے ہیں کچھ اس طرح سے دی ہے کہ وہ اب اقبال بخت نہیں بلکہ اقبال بھائی اقبال میاں ،اقبال بھیا ہے۔

''اب وہ سارے گھر کے لئے''اقبال میاں'' اقبال بھائی ،اور اقبال بھیا بن چکے تھے ۔ پہلو کے لان پر املتاس کا بڑا درخت ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سائے میں کھاٹ

بچھا کر فرصت کے اوقات میں محفل جمتی تھی۔ اس کی صدارت
ڈراوَر صاحب کرتے تھے ۔ نائب صدر اقبال بھائی خود بخود بن
جاتے تھے ۔اس محفل کے دوسرے اراکین استاد یوسف خان ،جمنا
پانڈے مہاراج چپراسی ،عبدل بیر اور بھائی تھے میں بن بلائے
مہمان کی حیثیت سے اِدھر اُدھر ہلکی رہتی تھی۔''۳۹

اقبال جب اس گھر میں پہلی بار آئے تھے تو اقبال بخت تھے مگر قرۃ العین حیدر نے بتایا کہ ہماری قومی یکجہتی جیسی اور آپسی بھائی چارگی کی وجہ سے وہ کس طرح اقبال بھائی اور اقبال بھیا بن گئے ۔اوراس گھر میں ایک محفل سجی تھی اس میں کس طرح ہر مذہب کے لوگ محفل میں موجود ہوتے ہیں ۔بغیر مذہب وملت سب مل جل کرر ہتے تھے ۔اس محفل میں عبدل بھی ہے جمنا پانڈے بھی ہے اقبال بھی ہے اوراستاد یوسف بھی ہیں کس طرح اس محفل کے ارکان میں سبھی قوموں کے لوگ موجود رہتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشترکہ تہذیب جو ہمیں ورثے میں ملی ہے اس کے عناصر قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں بھی پائے جاتے ہیں ۔انہوں نے مشترکہ کرداروں کا اپنی تخلیقات میں استعمال کرکے قومی یکجہتی ااور آپسی بھائی چارے کی مثالیں پیش کی ہیں۔

آج جب کہ ہمارے ملک میں جو ماحول پیدا ہوا ہے اس کے خلاف قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے۔کردار اقبال بخت کے ذریعے قرۃ العین حیدر بتاتی ہیں کہ کس طرح ہمارے سماج میں ہندو مذہب کے لوگوں میں بھی رواج تھا کہ وہ اپنے نام فارسی اور اردو نام رکھتے ہیں اس سے مذہب میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ مشترکہ تہذیب کی عکاسی ہوتی

تھی ۔ اقبال بخت منی کو ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے اور وہ بھی بڑی خوش مزاجی کے ساتھ ۔ اپنیت کے ساتھ جس کو قرۃ العین حیدر نے اس طرح پیش کیا ہے :۔

''اقبال بھائی جمع تفریق پر سر کھپانے کے بعد حکم دیتے ۔ تختی لاؤ'' تختی پر وہ بے حد خوش خطی سے لکھتے ۔

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

اپنے ٹیڑھے میڑھے حروف میں میں اس شعر کو کئی مرتب لکھتی یہاں تک کہ میری انگلیاں دکھنے لگتیں اور میں دعا مانگتی ۔ اللہ کرے اقبال بھائی مرجائیں ۔ اللہ کرے ۔[۴۰]

قرۃ العین حیدر نے اس کردار کے ذریعے بتایا کہ کس طرح یہاں کے لوگ کس طرح ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں ہمدری لئے ہوئے ہیں۔ بھائی چارگی کی مثال کس طرح قائم کی ہے کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ کس طرح مشترکہ کلچر، رہن سہن، مشترکہ زبان اور بھائی چارگی کس طرح قائم کی ہے ۔ اس کی ایک بڑی مثال اقبال بخت ہے جواب اقبال بھائی یا اقبال بھیا کے نام سے مشہور ہوگیا ہے جو شاعری بھی کرتا ہے ٹیوشن بھی پڑھاتا ہے مزدوری بھی کرتا ہے۔ لیکچر بھی دیتا ہے اور جب وہ ملک چھوڑ کر امریکہ چلا جاتا ہے کہ کس طرح وہاں ایسے ہندوستانی لوگوں کی بغیر مذہب وملت کس طرح ان کی سیوہ کرتا ہے قرۃ العین حیدر نے اپنے کردار اقبال بخت کی ایک اور صفت بھی گنائی ہے کہ وہ کسی مذہب میں یقین نہیں رکھتے بلکہ انسانیت پر یقین رکھتے

ہیں اس لئے کبھی اپنے آپ کو ہندو کبھی مسلم کبھی عیسائی کہتے ہیں جس کو قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

''اگلے روز بی بی سی میں اقبال بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ......'' اقبال بھائی ! اب آپ یہ فراڈ بھی کرنے لگے ۔ ان لڑکیوں کے سامنے آپ نے خود کو مسلمان ظاہر کیا ہے ؟ نہ صرف مسلمان بلکہ شیعہ جواب ملا ...... دیکھ منی ...... دنیا میں اس قدر تفرقہ ہے کہ سب ایک دوسرے کی جان کو آئے ہیں۔ میری جب اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے نام کی وجہ سے مجھے مسلمان سمجھی اور میرے سامنے ہندوؤں کی اور ہندوستان کی خوب خوب برائیاں کیں ۔ اسکے بعد اگر میں اُس کو بتا دیتا کہ میں ہندو ہوں تو اسے کس قدر خجالت ہوتی اور پھر اس میں میرا کیا ہرج ہے ۔ میرے خاندان میں سینکڑوں برس سے فارسی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس سے ہندو دھرم میں کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اگر میں نے خود کو مسلمان ظاہر کر دیتا ہے تو دنیا میں کونسی قیامت آجائے گی؟...... بتاؤ......؟ ارے واہ رے منی !............ اتنی بڑی افلاطون بنتی ہو، مگر عقل میں وہی بھوسہ بھرا ہے ۔''[۱۴]

قرۃ العین حیدر نے یہاں مذہب سے ہٹ کر انسانیت کی بات کی ہے کہ انسان بھائی چارگی کی وجہ سے زیادہ پہچان رکھتا ہے ۔ مذہب اپنی جگہ مکمل ہے مگر انسان میں اگر

انسانیت نہیں تو وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ لوگ اس کو ہرگز عزت اور وقار نہیں دیں گے۔ قرۃ العین حیدر نے ہندوستان اور پاکستان قوم دونوں کو ایک سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اپنے اس افسانے میں کی ہے ۔ وہ ہمیشہ قوم اور ملک کی قومی یکجہتی اور آپسی تعلقات کی خواہاں رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ کردار اقبال بھائی کے ذریعہ پاکستان کی نمائندگی کی بھی بات کرتی ہیں۔ جب وہ ایک فیسٹیول میں پاکستان کی نمائندگی کی بات آتی ہے کہ اقبال بنیادی طور پر ہندوستانی ہے مگر وہاں وہ اسٹیج پر پاکستان کی نمائندگی کچھ اس طرح سے لند میں کرتا ہے ۔

> '' اقبال بھائی سمیت طلبا کا بہت بڑا جتھا سالانہ یوتھ فیسٹیول کے لئے پراگ جارہا تھا۔ اس سال پاکستانی طلبہ کو کمیونسٹ ممالک جانے کی ممانعت کردی گئی تھی اوران میں سے چند لوگ اس وجہ سے بہت دل گرفتہ تھے ۔ وفد کے پراگ روانہ ہونے سے ایک روز قبل ایک تقریب میں مشرقی پاکستان کے ایک طالب علم نے افسوس کیا'' ہم لوگ اس سال نہیں جا سکتے ۔ادھر ورلڈ کا سارا کنٹری ہوگا۔ خالی پاکستان نہیں ہوگا۔ اقبال بھائی فوراً اس کے پاس گئے اوررسان سے بولے ۔'' نور الفرقان بھائی ! دل چھوٹا مت کرو پاکستان کی نمائندگی میں کردوں گا ۔۴۲

یہاں ہمارے ملک کے لوگوں میں چاہئے مذہب الگ ہوں ملک تقسیم ہو گیا ہومگر یہاں کے صوفی سنت ایک ہیں یہاں کا کلچر ایک ہے یہاں کی قوم ایک ہے ۔ یہاں کے

لوگوں میں جب کوئی پریشانی ہوتی ہے کوئی تکلیف ہوتی ہے چاہے وہ کتنا بھی مذہبی کیوں نہ ہو اس وقت وہ مندروں مسجدوں یاتراؤں ،فقیروں ، درگاہوں میں ہر جگہ جاتے ہیں اور یہی ہماری اپنی پہچان ہے اور یہی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی ہے جس کی مثال قرۃ العین حیدر نے ساردامہتہ کے ذریعہ کچھ اس طرح دی ہے:

''شاردا مہتہ ایک سیدھی ساری، نارمل ، مذہبی قسم کی ہاؤس وائف ہے اور جب سے اس کی اکلوتی بیٹی پولیو میں مبتلا ہوئی ہے ، پوجا پاٹ ، مندروں یاتراؤں ، سادھو سنتوں، پیروں فقیروں ، درگاہوں اور منتوں مرادوں کا سلسلہ اس کے یہاں بہت زیادہ ہوگیا ہے ۔ یوں بھی وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی خوش عقیدگی بھروسے یقین اور رجائیت کی بنا پر دنیا قائم ہے ۔''۴۳

مندرجہ بالا چند مثالو ں سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اس افسانے ''قلندر'' میں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثال ملتی ہے ۔ اورانہوں نے اقبال بخت کو نہ صرف استاد گورو مانا بلکہ اس کردار کے ذریعے انسانیت کا درس بھی دیا اور اخیر میں کردار اقبال بھائی کو وہ ان الفاظ میں یاد کرتی ہیں ۔

''بچپن میں اقبال بھائی نے میرے کان اینٹھے تھے ۔ ڈانٹ ڈانٹ کر انتہائی سخت گہری اورمحنت سے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ اوراستاد کا رتبہ ماں باپ کے برابر ہوتا ہے ۔ وہ دنیا کے لئے کس چکر میں اور کس طریقے سے گورو جی بن گئے تھے لیکن ان

گورو سمجھنے کا حق صرف مجھے پہنچتا ہے۔[۴۴]

سکریٹری:

سکریٹری قرۃ العین حیدر کا ''روشنی کی رفتار میں شامل پانچواں افسانہ ہے۔ اس میں دولت مند اور مفلس کے درمیان فرق کو موضوع بنا کر قرۃ العین حیدر نے یہ افسانہ تحریر کیا ہے۔ رانی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ جو منظور کو اپنا سکریٹری رکھتی ہے لیکن جب تک منظور جوان اور خوبصورت تھا رانی اس کی قسم نہیں کھاتی تھی مگر جب منظور بوڑھا ہو جاتا ہے رانی منظور کی جگہ ایک دوسرا سکریٹری رکھ لیتی ہے جس کا نام عرفان ہے۔ پہلے تو یہ سماجی اور اقتصادی نابرابری کو موضوع بنا کر لکھا گیا افسانہ ہے مگر اس میں بھی قرۃ العین حیدر نے بھائی چارگی کے عناصر کا استعمال کیا ہے۔ رانی اور مصنفہ کی پھوپھو کی دوستی کافی زبردست تھی اور ان کے پھوپھا بھی رانی کا خیال رکھتے تھے ویسے تو رانی ہندو تھی اور مصنفہ اور ان کے پھوپھا مسلم مگر وہ رانی کا بہت خیال رکھتے تھے جس کو مصنفہ نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ''یہ ڈمینتی دیوی آف رام کوٹ راج تھیں۔ جن کو اس دور میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میری عمر جب کوئی چھ برس تھی۔ ان کی وہ کپڑے والی تصویر اوران کا لان پر آنا آج تک مجھے اسی طرح یاد ہے۔ اس وقت راجہ صاحب کے انتقال کو سال بھر ہوا تھا اور علاقہ کورٹ میں تھا۔ پھوپھی اور ان کی بہت دوستی تھی اور پھوپھا بھی

ان کا بہت خیال رکھتے تھے وہ بے چاری زمینداری کے جھگڑوں
میں گھر ہوتی تھی اور رشتہ دار ان کی مدد کرنے کے بجائے ان کے
مقدمے لڑ رہے تھے۔ عدالتی دیکھ بھال کی غرض سے وہ اینگلو
انڈین گورنس سے انگریزی بھی سیکھ رہی تھیں۔ رنیتی دیوی خود ایک
پابند وضع تعلق دار کی بیٹی تھیں اور پردے میں رہتی تھی۔۴۵؎

ویسے تو پردے کا رواج مسلمانوں میں ہوتا تھا لیکن یہاں ہمارے ہندوستان میں ہندو بھی پردے میں رہتے ہیں۔ یہ یہاں کی مشترکہ تہذیب ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں بتایا ہے۔ اس کے بعد دوسری بات یہ کہ رانی جب اکیلی تھی تو مصنفہ کے پھوپھی اور پھوپھا کے پاس آتی تھیں اور وہ بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔ رانی کے اپنے گھر والے اس کے رشتہ دار اس سے زمینی جھگڑوں میں گھرے ہوئے تھے مگر باقی آس پڑوس والے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ رانی صاحبہ کو جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تو وہ ان کو بتاتی اور یہ لوگ بھی رانی کی مدد کرتے۔

اس کے علاوہ بھی قرۃ العین حیدر کے اس افسانے میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے عناصر موجود ہیں جب کہ سب سے الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں مگر......وقت یا کسی پارٹی میں سب لوگ کچھ اس طرح سے اکٹھے ہوتے ہیں کہ مذہب کی کوئی پابندی نہیں۔ مہمان اور میزبانی ایک دوسرے کی کرتے ہیں اگر کوئی مسلم کسی ہندو کے گھر گیا تو وہ اس کو مہمان بنا کر کچھ یوں رکھتا ہے جس کی مثال یہ ہے:۔

’’کوئی دو تین برس ادھر کی بات ہے۔ میں اپنے میزبانوں،

> شوبھا اور ترلوک ماتھ اور شوبھا کی چھوٹی بہن نلنی کے ساتھ دلی کے میڈتر ہوٹل کے ایک تقریباً سنسان ڈرائنگ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھی تھی۔ باہر کڑا کا کا جھاڑا تھا۔ آتش دان میں تیز آگ لہک رہی تھی۔ اور ہم لوگ کافی ختم کر کے گھر جانے کا ارادہ کررہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ امریکن جوڑا قریب سے گذرا۔ اس کے بعد ستر برس سے اوپر کی عمر والے امریکن سیاحوں کی ایک پوری ٹولی ڈرائنگ روم سے گزر کر برابر کے کمرے میں چلی گئی۔''

غرض یہ کہ ہر مذہب کے لوگ ہوٹلوں میں رہتے ہیں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں یہاں کی تہذیب کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں بھی پیش کیا ہے اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو بھی۔

دوسیاح:

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے کا تانا بانا مغل عہد سے لیکر جنگ آزادی تک کو بتایا ہے کہ کس طرح ایک خوشحال ملک کو بربادی کے دھانے تک لے جایا گیا۔ یہاں ہندو مسلم سکھ سب مل جل کر رہتے تھے۔ یہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں تھی مگر جب انگریز یہاں آئے تو انہوں نے کس طرح اپنی پالیسی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنالی اس سے ہندوستانی قوم کو بہت نقصان پہنچا۔ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی جو مثالیں ہمیں اپنے ملک ہندوستان میں ملتی تھی اس کو کس طرح زک پہنچائی۔

قرۃ العین حیدر نے شعوری اور غیر شعور طور پر مغل حکمران اکبر اور انگریزی ملکہ ملکہ الزبتھ اول کی روح کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مغل عہد میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی قائم تھی۔قرۃ العین حیدر نے قومی غم اور موجودہ صدی کی بھاگ دوڑ زندگی ، سماج کا ہر طبقہ اس وقت گمراہ نظر آتا ہے ۔ ہندوستان اور پاکستان تقسیم ،ہندو مسلم تعلیم ،ایسی جنگ ان سب چیزوں کو اس افسانے میں بتایا ہے ۔قومی یکجہتی کی ایک مثال قرۃ العین کی ایک مثال قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں کچھ یوں پیش کیں ہیں:۔

> ''سکریٹری لندن سے زیادہ پررونق ہے ۔شاہی تقریبات اور جشن ، ہندو اور مسلم تہوار ، جلسے اور جلوس ، خوشحال متوسط طبقہ ،باکمال کاریگر ، علماء ،شعراء مدراس کے طالب علم ، اہل سیف اور تاجر اور منصب دار ، سادھو سنت اور صوفیاء وفقراء ......آگرہ سے سیکری تک راستے بھر بازار اور دوکانیں تھیں۔''۴۶

قرۃ العین حیدر نے کس طرح قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں جو سولہویں صدی میں اکبر کے عہد میں تھیں دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ صدیوں سے ہمارے ملک میں مشترکہ تہذیب تھی۔ رشی منی اکٹھے بیٹھتے تھے صوفی سنت کس طرح بھائی چارگی قائم رکھتے تھے ۔کس طرح باکمال کاریگر اس ملک کی ترقی کے ستون تھے کوئی آپسی جھگڑا نہیں تھا۔کس طرح کا سیکولر قومی ملک ہمارا تھا اس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں موضوع بنایا اور عوام وخاص اور میل ملاپ سے ملک ترقی کرتے ہیں۔آج ہم جس سیکولرازم کی بات کرتے ہیں وہ سیکولرازم نہیں بلکہ ایک دھوکہ ہے سیکولرازم کی قرۃ العین

حیدر نے ایک مثال یوں دی ہے:

''ایک خستہ حال نو جوان طالب علم ''آنکھ مچولی'' کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے ایک دوست سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ان حجروں اور پھاڑکوں سے نکل کر اس نے سارا ہندوستان فتح کیا۔ سارے ہندوستان کو متحد کیا۔ سولہویں صدی میں اس نے ایک سیکولر قومی ریاست کا خواب دیکھا، لیکن اس شاداب، عظیم الشان دولت مند ملک پر سورج ڈوب کر دور، اس اندھیرے سے، سرد کہر آلود، غریب جزیرے پر طلوع ہونے والا تھا۔ کیوں ہارے ہم لوگ؟ ان حجروں اور ایوانوں میں وہ ساری آوازیں گونج رہی تھیں۔ کرنی، نظری، بیربل، فیضی، خان خانان، ٹوڈرمل، مان سنگھ، تان سین، عبدالصمد، فرخ بیگ، مکند، کیشو، حیرت انگیز''[۴۷]

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قرۃ العین حیدر کے اس افسانے ''دوسیاح'' میں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔

اگرچہ قرۃ العین حیدر کے ابتدائی افسانوی میں رومانی رنگ نظر آتا ہے مگر آہستہ آہستہ جیسے جیسے ان کا تخلیقی شعور وسیع ہوتا گیا اس میں ہر طرح کے رنگ ہمیں نظر آنے لگے اور ''روشنی کی رفتار'' تک پہنچ کر انہوں نے بڑے افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ وہ ہمیشہ مشترکہ تہذیب میں پلی بڑھی اور اسی وجہ سے ان کے بیشتر افسانوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔

حواشی

۱۔ جدید اردو افسانے میں سماجی وثقافتی جہات   احمد طارق۔ص۲۱۹

۲۔ نیا افسانہ   وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ص۷۹

۳۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ، ڈاکٹر زرنگار یاسمین۔ص،۱۲،۱۱

۴۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ، ڈاکٹر زرنگار یاسمین۔ص،۳۱

۵۔ قرۃ العین حیدر فکر وفن............ڈاکٹر شیفتہ پروین۔۶۶،۴۴

۶۔ قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک۔۵۷،۵۸

۷۔ ستاروں سے آگے   قرۃ العین حیدر۔ص۷ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۸۔ ایضاً،   ص ۹

۹۔ ایضاً،   ص ۷

۱۰۔ ایضاً،   ص ۸

۱۱۔ ایضاً،   ص ۶۰

۱۲۔ ایضاً،   ص ۶۲

۱۳۔ ایضاً،   ص ۶۰

۱۴۔ ایضاً،   ص ۶۲

۱۵ ایضاً، ص ۸۵

۱۶ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۷ ایضاً، ص

۱۸ ایضاً، ص

۱۹ ایضاً، ص

۲۰ ایضاً، ص

۲۱ ایضاً، ص ۱۵۵

۲۲ شیشے کے گھر قرۃ العین حیدر۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔

۲۳ ایضاً، ص ۳۰۶

۲۴ ایضاً، ص ۳۰۷

۲۵ ایضاً، ص ۲۹۰

۲۶ ایضاً، ص ۲۹۰

۲۷۔ایضاً، ص ۲۹۹

۲۸ ایضاً، ص ۲۹۹

۲۹ ایضاً، ص ۳۰۰

۳۰ ایضاً، ص ۳۰۱

۳۱ پت جھڑ کی آواز۔قرۃ العین حیدر قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ص ۳۳

۳۲ ایضاً، ص ۶۲

۳۳ ایضاً، ص ۶۲

۳۴ ایضاً، ص ۱۳

۳۵؎ ایضاً، ص ۲۵

۳۶؎ ایضاً، ص ۱۵

۳۷؎ ایضاً، ص ۱۵

۳۸؎ ایضاً، ص ۱۴۴

۳۹؎ ایضاً، ص ۱۴۵

۴۰؎ ایضاً، ص ۱۵۴

۴۱؎ ایضاً، ص ۱۶۲

۴۲؎ ایضاً، ص

۴۳؎ ایضاً، ص ۱۶۶

۴۴؎ ایضاً، ص ۱۶۸

۴۵؎ روشنی کی رفتار۔قرۃ العین حیدر۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔۵۹

۴۶؎ ایضاً، ص ۹۴

۴۷؎ ایضاً، ص ۹۴

باب چہارم

قرۃ العین حیدر کی دیگر تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

قرۃ العین حیدر کو دوسرے ادیبوں پر یہ فوقیت حاصل رہی ہے کہ جہاں انہوں نے افسانوی ادب میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے وہی غیر افسانوی ادب میں بھی گراں قدر کارنامے انجام دیئے ۔ غیر افسانوی ادب میں انہوں نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت حد تک کامیاب بھی رہی ۔ ان غیر افسانوی صنف میں رپورتاژ، خاکے، مضامین ،تراجم ،خطوط بچوں کا ادب وغیرہ شامل ہیں۔ رپورتاژ کے دو مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ ا۔ستمبر کا چاند اور ۲۔ کوہ دماوند۔ مرتب کتابوں میں رداماں باغبان۔۲۔ کف گلفروش ۔۳۔ ہوائے چمن میں خیمۂ گل وغیرہ ۔تراجم میں ا۔ غالب اینڈ ہنز یونٹری ۔۲۔ہمیں چراغ ہمیں پروانے ۔۳۔ ماں کی کھیتی۔۴۔ ابلیس کے گیت ۔۵۔ تلاش ،فیض کی نظمیں۔ کلام میرؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔خطوط ایک مجموعہ دامان باغبان کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے متعدد مضامین خاکے ، متراجم مرتب کتابیں تحریر کیں ہیں۔ ان تمام میں جہاں حیدر نے دوسرے مسائل کی عکاسی کی ہے وہیں حیدر نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو موضوع بنایا ہے ۔ اور اس موضوع پر انہوں نے بے حد اہم مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ ماضی میں ہمارے ملک اور ہماری قوم میں کس قدر یک جہتی تھی اور جس کو برقرار رکھنا لازمی ہے ۔ اس غیر افسانوی ادب میں خاکے مضامین اور رپورتاژ پر تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں کئی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے مضامین میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر:۔

قرۃ العین حیدر کا نام بڑے ادیبوں اور قلمکاروں میں آتا ہے۔ جہاں انہوں نے ناول ناولٹ افسانے ، اورر پوتاژ لکھے وہی انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ۔ یہ مضامین جہاں انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھے ہیں وہی کچھ مضامین انہوں نے ادبی ہستیوں پر بھی تحریر کئے ہیں ان مضامین میں بھی قرۃ العین حیدر نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو برتنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے یہاں چند مضامین میں جن میں میں نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو مثالوں کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔قرۃ العین حیدر(آپ بیتی) ۲۔اردو ناول کا مستقبل
۳۔ادب اور خواتین ۴۔انیس قدوائی کی ادبی خدمات
۵۔بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ ۶۔جشن گلزار
۷۔الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے۔ ۸۔ایک منفرد خاتون :ہماری حسنہ آیا
۹۔ یہ خلد بریں ارمانوں کی ۱۰۔ایک منفرد خاتون بیماری حسنہ آیا

قرۃ العین حیدر کے ان مضامین کو’’گل صد برگ‘‘ کے نام سے ڈاکٹر مجیب احمد خان نے ۲۰۰۶ء میں مرتب کیا اور کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی سے شائع کروایا۔ اس کتاب کا پہلا مضمون قرۃ العین حیدر کی آب بیتی ہے یہ مضمون حیدر پر تحقیق کرنے والوں کے لئے بے حد اہم اور معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس مضمون کے علاوہ دیگر مضمون بھی اس جو کتاب

میں شامل ہیں قرۃ العین حیدر کی شخصیت اوران کے فن کو سمجھنے کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں جہاں تک ان مضامین میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بات ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے ان مضامین میں بھی ان عناصر کو بہت حد تک برتنے کی کوشش کی ہے مثلاً قرۃ العین حیدر نے اپنی اس آپ بیتی میں اپنی ایک بچپن کی دوست جو ایک ہندو تھیں کے بارے میں یوں کہتی ہیں:۔

''دریا کے کنارے اونچے سہ منزل مکان کے صحن میں اوشا ناچ رہی تھی چھن چھن چھن۔ اس کے جوان سال ماں باپ ہمارے والدین کے گہرے دوست تھے۔ ان کا نام شاہد سیٹھ نرنجن داس تھا۔ ان میاں بیوی کی تصویر ہمارے ڈائنگ روم کے آتشدان پر رکھی رہتی تھی۔ بانکے والد کی نوکیلی مونچھیں۔ ڈریس سوٹ۔ والد بالکل سرت چندر کی ہیروئن۔ وہ کون لوگ تھے؟ کہاں گئے جواب ان کے متعلق بھی بتانے والا کوئی نہیں۔ تاریخ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔[1]

یہ قرۃ العین حیدر کے ابتدائی پڑوسی تھے جن کو وہ تمام عمر یاد کرتی رہی اور اپنی اس آپ بیتی میں بھی ان کا ذکر کیا۔ قرۃ العین حیدر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے ایک دوسرے کے گھروں میں تصویریں سجا کر رکھی ہوئی تھیں۔ مگر جب ملک تقسیم ہوا لوگ بکھر گئے ایک دوسرے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی قرۃ العین حیدر اپنے آپ سے سوالیہ انداز میں پوچھتی ہیں کہ وہ لوگ کدھر گئے اور کہاں جا کر بسے

ان کا کچھ پتہ نہیں ہے مطلب یہ کہ وہ لوگ جو گھروں میں ایک دوسرے کی تصویریں رکھتے تھے ایسے فرار ہوئے کہ ایک دوسرے کا کوئی اتہ پتہ بھی نہ رہا۔ قرۃ العین حیدر نے آگے اپنی آپ بیتی میں بتایا کہ ان کی کھوج جاری رکھی اور پتہ چلا کہ اٹلی چلے گئے اس سے بڑھ کر اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو بچپن میں حیدر کے پڑوسی تھے ملک بدر ہو کر اٹلی چلے جاتے ہیں مگر حیدر ان کا پتہ لگا لیتی ہے کہ وہ کہاں گئے اور کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح آگے حیدر نے اپنی آپ بیتی میں اپنے بچپن میں اپنے رشتہ داروں اور کزن کے بارے میں جب وہ بچپن میں کھیلتے تھے اور ایک دوسرے کی چیزیں آپس میں لین دین کرتے تھے ان کو بھی کچھ یوں تحریر کیا ہے:

> ''کزن پارے میاں کو ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوائی بندوق عطا کی جس کے بدلے میں انہوں نے مجھے اپنا مکینوسیٹ اور چڑیوں کے رنگین پر پیش کئے۔ کزن اچھو نے اپنا گڑیا کا ناشتہ دان عنایت کیا۔ میں نے ان کو اپنی سرخ پھولوں والی ہیٹ۔ کزن شاہجہاں بیگم بنت نواب محمود پور دہرہ دون آئیں۔ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر انہوں نے بٹوے میں سے ریز گاری نکالی۔ اسے احتیاط سے گنا اور نہایت متانت کے ساتھ کہا'' یہ بارہ آنے میں، میں اس کی ایک اچھی سی موٹر خرید نا چاہتی ہوں۔[۲]

حیدر نے بتایا ہے کہ یہاں کے بچوں میں بھی بھائی چارگی کس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مثلاً ایک دوسرے سے لین دین ایک نے اگر کچھ دوسرے کو دیا تو دوسرا

بھی اس کے بدلے کچھ نہ کچھ اسے ضرور اپنی طرف سے دے گا ایسا ہر گز نہیں کہ لیا اور اڑھ گئے ۔قرۃ العین حیدر کی یہ بچپن سے عادت رہی کہ وہ ہر قوم اور ہر مذہب کو احترام سے دیکھتی رہی اور اس کی قدر کرتی رہیں چونکہ ان کے دوست احباب ہر مذہب اور ہر قوم سے تعلق رکھتے تھے ۔قرۃ العین حیدر اپنے بہترین دوستوں کے بارے میں جو دوسری قوموں سے تعلق رکھتے تھے یوں رقمطراز ہیں:

''مجھے ہر ملک اور ہر قوم اورفرقے میں بے انتہا پر خلوص اوراچھے دوست ملے ہیں۔ ہندوستان ، پاکستان ، بنگالی ، پنجابی، پٹھان، گجراتی ، انگریز ، امریکن ، یوروپین، روسی ، پارسی ، یہودی اور یہ دوستیاں پرانی اور پائیدار اور پر خلوص ہیں۔ کہاجاتا ہے کہ جس کے دوست زیادہ ہوں دراصل اس کو کوئی دوست نہیں ہوتا ۔ میرے خیال میں مفروضہ قطعی غلط ہے اور میرے احباب میں متعدد اہل قلم بھی شامل ہیں۔ معاصرانہ چشمک'' والی بات بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''[۳]

اسی مضمون میں دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

'' کہاں کی ''معاصرانہ چشمک'' اپنے دوستوں کی اچھی تخلیقات کے علاوہ اگر مجھے کسی بھی ادیب کی کوئی چیز پسند آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں ۔میں نے السٹریٹیڈ

ویکلی آف انڈیا میں انتظار حسین ، خالدہ اصغر، ابوالفضل صدیقی
اورآغا بابر کے افسانے جو مجھے بہت اچھے لگے فوراً رترجمہ کر کے
شائع کئے ۔اس سے قبل میں ہاجرہ ، خدیجہ اور کئی ادیبوں کی چیزیں
انگریزی میں ترجمہ کر چکی ہوں۔

معاصرین سے پرخاش اور اپنے سے سینئر ادیبوں کا مذاق
اڑانا یا ان کے ساتھ بدتمیزی کے موجودہ رویے میرے لئے تعجب
خیز ہیں۔ کسی Personality Problem کے فقدان کی وجہ
سے لوگوں سے فوراً دوستی کر لیتی ہوں۔[۹]

قرۃ العین حیدر کے اس مضمون سے بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ملتے ہیں جس کو پڑھ کر ہر خاص عام کے دل میں ایک دوسرے کے لئے قدر و قیمت پیدا ہوتی ہے ۔ ایسا ہی آگے ایک اور مضمون ''انیس قدوائی کی ادبی خدمات'' ہے جس میں قرۃ العین حیدر نے انیس قدوائی کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کو بھی پیش کیا ہے کہ کس طرح ایک حیدر نہیں بلکہ یہاں کے دوسرے ادیب بھی اس مشترکہ تہذیب کی پاسداری کس طرح سے کرتے ہیں جس کو مصنفہ نے کچھ یوں بیان کیا ہے :

''انیس باجی نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر وہ
اردو تہذیب اور اودھ کے گنگا جمنی کلچر کی پروردہ تھیں۔ ان کی
معلومات وسیع اور اردو فارسی ادب ، تصوف، الٰہیات ، تاریخ ،
عالمی سیاست اور سماجی مسائل پر ان کی بصیرت تعجب خیز ، طنز و مزاح

ان کا صل میدان تھا۔ان کے والد ولایت علی بمبوق کے جو مزاحیہ
کالم کا مریڈ اور نیوایرا میں چھپا کرتے تھے ، بے حد مقبول تھے ۔
حس ظرافت انیس باجی نے اپنے والد سے حاصل کی تھی۔''۵؎

یہاں ہمارے ملک کی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں چونکہ یہاں ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ آپس میں مل جل کر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں جس کی مثالیں اور دوسری تہذیبوں یا ملکوں میں ملنی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہیں۔ انیس قدوائی بھی اسی تہذیب کا کردار ہیں جس کے لئے وہ بہت مشہور تھیں۔

قرۃ العین حیدر نے جتنے بھی مضمون تحریر کیے یا جن جن شخصیات پر انہوں نے مضمون لکھے انہوں نے ان کے اندر چھپی ہوئی تصویر کو ضرور ابھارا اور جو تصویر آپسی بھائی چارے کے عکس سے بنی ہوئی تھی مثلاً بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ پر لکھے ہوئے مضمون میں وہ رقمطراز ہیں:

''اپنے تمام اختلافات کے باوجود ہندوستان اور پاکستان میں ایک خصوصیت البتہ مشترک ہے۔حصول زر کی خواہش اور ایک Consumer society کا ارتقاء ، ہندوستان کے نچلے طبقے میں جہیز کا مزید مطالبہ پورا نہ کر سکنے کے ''جرم'' میں ''عروس سوزی'' کی وارداتیں آئے دن اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس قسم کے بھیانک جرائم کی اِکّا دُکّا خبریں مسلمانوں کے ہاں بھی ملنے لگی ہیں۔صوبہ بہار اور آندھرا پردیس وسابق ریاست حیدرآباد دکن

کے مسلمانوں کے ہاں لڑکے والوں کی طرف سے جہیز اور ''جوڑے گھوڑے'' کے مطالبات میں تیزی سے اضافہ ہوتا جارہاہے۔[6]

بیگم شائستہ سروری اکرام اللہ ایک اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی مگرانہوں نے ہمیشہ عورتوں کی بات کی اور عورتوں کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت آواز بلند کی حالانکہ ان کو کبھی بھی کسی جہیز وغیرہ کے لئے خود پریشانی نہیں ہوتی مگر آپسی بھائی چارے میں دوسرے کے لئے ہمدردی اور درد ان کے دل میں ضرور تھا جس کو انہوں نے اپنی قلم کے ذریعے مظلوم عورتوں کے حق میں لکھا۔قرۃ العین حیدر نے بھی ہمیشہ ظلم کا ساتھ کبھی نہیں دیا اور ہمیشہ نرم مزاج کی خاتون رہی ۔ بڑوں کی قدر ہمیشہ ان کے دل میں رہی انہوں نے جہاں کہیں بھی کسی خاتون یا مرد ادیب کی بات کی ہمیشہ آداب والقاب کے ساتھ ان کا نام لیا مثلاً حسنہ آپا، شائستہ آپا، سلطانہ آپا، ہمیشہ بڑوں کو عزت دی اور یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں انہوں نے بیگم شائستہ کے ساتھ آپا ہرجگہ استعمال کیا ہے ۔ دور حاضر کے متعلق بھی قرۃ العین حیدر نے ''جشن گلزار' کے موقعے پر اپنی تقریر میں جو اس کتاب میں شامل ہے بہت مدلل باتیں کیں ہیں۔ دورحاضر کی سیاست کو انہوں نے طنز کیا جس کے درعمل میں مثبت اور منفی اثر ہماری تہذیب پر پڑتے ہیں یوں کہتی ہیں:

''ہمارے یہاں اپنے اپنے ماضی کے شدید احساس نے مختلف فرقوں میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کئے جن سے مختلف نتائج برآمد ہوئے ۔ بہر حال وہ سرخ پوش طویل

القامت پروہت اپنے راستے پرگامزن ہے اورکمبل پوش کشمیری
صوفی بھی چنار کے درخت کے نیچے جائے نماز بچھائے بیٹھا ہے ۔
یہ دوفیگر منجمد بھی ہیں اورمتحرک بھی آج کے دور میں جبکہ وقت بہت
تیزی سے بدل رہاہے ۔ پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی جن کا نام
ہی اس ساری تاریخ کا مظہر ہے۔ وہ جس روایت کی نمائندگی
کرتے ہیں وہ عالم گیر Humanism کی ایک درخشاں روایت
ہے .... یہ ناچیز مشرق ومغرب کے مختلف ملکوں کی سیر کرچکی
ہے لیکن کہیں ایسی رنگا رنگ کثیر الجہت تہذیب نہیں دیکھی جو بر
صغیر ہندوستان ، پاکستان اور بنگلہ دیش میں موجود ہے۔ سارے
لڑائی جھگڑوں ، بیوقوفیوں اورحماقتوں کے باوجود یہ تینوں گاڑیاں
چھک چھک چلے جارہی ہیں ۔؎

ہمارے ملک میں اسکولوں اورکالجوں میں بھی مشترکہ تہذیب ملتی ہے ۔ جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یہاں اسکول میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی اکھٹے پڑھتے ہیں کبھی کسی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے الگ اسکول اور کالج قائم نہیں ہوئے اوران اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے والے بھی مشترکہ ہندو مسلم سکھ عیسائی ہوتے ہیں اور کبھی کسی کے ساتھ بھید بھاؤ نہیں کیا جاتا۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے ایک مثال ''پروفیسر پنڈت تربھون زتشی زار'' دہلوی کی کچھ یوں بیان کی ہے :۔

''علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی یادگارداغ جنہوں نے رٹائر ہونے کے بعد اندر پرستھ کالج دہلی میں ۳۹ سال اردو اور فارسی پڑھائی اور مجھے فخر ہے کہ اس کالج میں پنڈت جی میرے استاد تھے ۔ جہاں دہلی یونیورسٹی کے بی اے میں انگلش کے ساتھ اردو کا ایک پرچہ بھی لازمی تھا اور ایک دلچسپ بات جو آج کے لوگوں کو بہت انوکھی معلوم ہوگی وہ یہ تھی کہ پنڈت جی باضابطہ مولوی صاحب کہلاتے تھے اور ساری دہلی میں وہ مولوی صاحب کے لقب سے ہی مشہور تھے چنانچہ جاننا چاہئے کہ ہندومسلم اتحاد سرکاری پالیسی ،سمینار اور کانفرنسوں کے ذریعے تخلیق نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک خود روگلشن ہے جو صدیوں کی رواداری اور تہذیبی یگانگت کے ذریعے پیدا ہوا ہے ۔ دہلی لکھنؤ اور آلہ آباد میں پنڈتانِ کشا میر کی آبادیاں اسی فراخ دل اور رچی ہوئی تہذیب کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ لکھنؤ کے ایک مشہور معالج جو کشمیری پنڈت تھے ۔ ان کی بیٹی کا بیاہ ایک اور کشمیری پنڈت سے ہو رہا تھا۔ منڈپ میں پھیرے پڑنے والے تھے ۔ شادی کی ساعت جو برہمنوں نے اپنے علم کے ذریعے نکالی تھی اور آیا ہی چاہتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہماری دوست کے خاندان پیر جن کا انتقال ہو چکا تھا ان کی

کھڑاویں کشمیر سے اب تک لکھنؤ نہیں پہنچی تھی جس کے گرد گھوم کر
پھیرے ڈالے جاتے کیونکہ کشمیر میں سیاسی گڑبڑ شروع ہوچکی تھی
اور وہ لڑکا ابھی تک لکھنؤ نہیں پہنچا تھا۔ سارے منڈپ میں شدید
پریشانی اوراضطراب کا عالم طاری تھاجب آگیا آگیا کا شور مچا
اورنوجوان شاداں وخرماں منڈپ میں داخل ہوا۔ چنانچہ اگنی کے
گرد پھیرے ڈالنے کے بعد دولہا دلہن نے پیر صاحب کی کھڑاؤں
کا بھی طواف کیا تب شادی کی رسوم مکمل ہوئیں۔''۸

قرۃالعین حیدر نے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہاں بھائی چارگی قائم ہے ۔ یہاں ہندو اورمسلمانوں میں کس طرح صوفی سنت مشترکہ ہیں اورکس طرح ان کا حترام کیاجاتاہے یہاں کےصوفی سنتوں کے کھڑاؤں بھی کتنے احترام سے رکھے جاتے ہیں۔ایک شادی کی رسم اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک پیرصاحب کے کھڑاویے شادی کی رسم میں نہیں پہنچتے اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے تہذیب میں انسان کی کتنی قدر وقیمت تھی جوآج بھی کسی حدتک برقرار رہے حالانکہ چند ایک عناصراسے بگاڑنے کی بھرپورکوشش میں لگے ہوئے ہیں خواہ وہ ہندوہوں یامسلم ۔اس مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کےحوالے سےآگے حیدر یوں فرماتی ہیں:

''آج کے دور میں جب زیادہ تر رویئے منفی رجحانات کے
مظاہر ہیں اس تہذیبی ہم آہنگی کواگر اپنے معاشرتی رویوں کے
ذریعے اکثر نو دریافت اوراجاگرکیا جائے توہمارے بیشتر معاملات

خود بخود سلجھ جائیں گے۔ اردو شاعری میں استاد اور شاگرد کا یہ
سلسلہ کسی شاہی خاندان کے نسب نامے سے کم اہم نہیں ۔ اہل
مغرب روایت کے اس تسلسل کی معنویت سمجھنے سے قاصر ہیں
کیونکہ استاد اور شاگرد کا یہ کلچر مغرب میں مفقود ہے۔''۹

استاد اور شاگرد کا رشتہ ہمارے ملک میں بہت گہرا ہے ۔ یہاں کسی بڑے استاد کا شاگرد ہونے کے لئے لوگوں کو بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور پھر جتنا بڑا استاد اتنا ہی بڑا نام شاگرد کا اور کچھ استاد شاگرد کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہوئے مثلاً خان آرزو اپنے شاگردوں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے میرؔ جیسے کلام القدر شاگرد خان آرزو کو نصیب ہوئے ٹھیک اسی طرح میر حسن جو اقبال کے استاد تھے ۔ اقبال نے تو ایک بار خطاب لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ خطاب پہلے میرے استاد کو دیا جائے اس کے بعد میں اس کو قبول کروں گا ۔ اسی طرح کی ایک مثال قرۃ العین حیدر نے اپنے مضمون ''الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے'' میں کچھ اس طرح سے دی ہے :

''ہماری عزیز دوست فیروز جبین علی گڑھ سے گریجویشن کے
بعد احتشام حسین صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل کرنے کے لئے
لکھنؤ آ گئیں۔ وہ کیسا زمانہ تھا جب دانش گاہوں کے بیشتر پروفیسر
صاحبان مختلف علوم کے ایسے جید عالم تھے کہ ان کی شاگردی کا
شرف حاصل کرنے کے لئے دور دراز کے علاقوں سے چل کر
طالبان گومتی کے ساحل پر آن پہنچتے تھے ۔ ہمارے از بیلا تھوبرن

کالج میں سندھ اور بلوچستان کی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ کشمیر،
آسام اور کیرالہ کی بھی ۔ چنانچہ اس برصغیر میں نوجوانوں کی ایک
مشترکہ کلچر بن گئی تھی جس میں حصول علم کے اصول اعلیٰ ترین
برطانوی روایات پر مبنی تھے۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نیا ملیشیا یا
نیا افریقہ عہد برطانیہ کی دین ہے ۔ ورنہ ہماری وہ ہی حالت ہوئی
جوآج تک افغانستان یا تبت کی رہی ہے ۔''۱۰

قرۃ العین حیدر نے جہاں اپنے ناول افسانوں ناولٹ رپورتاژ میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو برتا ہے وہی انہوں نے اپنی دگر تخلیقات میں بھی اس مشترکہ تہذیب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کوبھی برتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے جس بھی ادیب پر لکھا یا جس بھی اصناف میں لکھا اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کے موضوع کو انہوں نے خوب استعمال کیا کیوں کہ حیدر خود اس مشترکہ تہذیب کی دلدادہ تھیں اور اسی تہذیب کی پیداوار تھی لہٰذا اس تہذیب کی انہوں نے اپنی تحریروں میں کثرت سے برتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے خاکوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر

ناول ناولٹ اور افسانوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے غیر افسانوی ادب میں بہت سے رپورتاژ مضامین اور خاکے لکھے ہیں۔ جس سے قرۃ العین حیدر کی تنقیدی شعور کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تنقیدی تحریروں میں بہت سے خاکے ہیں جو قرۃ العین حیدر نے مختلف ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ اور بعد میں یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے جن میں پکچر گیلری اور داستان طراز قابل ذکر ہیں۔ ان خاکوں میں بھی قرۃ العین حیدر نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان خاکوں میں سے چند کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ داستان طرز (چودھری محمد علی رودلوی)
۲۔ پکچر گیلری کی ایک تصویر (شاہد احمد دہلوی)
۳۔ چاند نگر کا جوگی (ابنِ نشاط)
۴۔ دیکھ کبیرا رویا (سعادت حسن منٹو)
۵۔ کچھ عزیز احمد کے بارے میں (عزیز احمد)
۶۔ لیڈی چنگیزی خان (عصمت چغتائی)
۷۔ ایران میں اجنبی (ن۔م۔ راشد)
۸۔ ایک مذہب ظرافت نگار (شوکت تھانوی)
۹۔ جہاں میں رہتا ہوں۔ (مہندر ناتھ)
۱۰۔ سرود شبانہ (فیض احمد فیض
۱۱۔ مجروح سلطان پوری
۱۲۔ شام اودھ کا ایک نغمہ نگار
۱۳۔ فلڈ مارشل (کشور ناہید)

۱۴۔ سپہ سالار (فہمیدہ ریاض)

۱۵۔ عطیہ خدا حافظ

۱۶۔ انسان دوستی کا سفیر کبیر

۱۷۔ اندھیری رات کا مسافر (اسرار الحق مجازؔ)

۱۸۔ سجاد حیدر یلدرم

قرۃ العین حیدر نے ''پکچر گیلری'' میں ان دلکش تحریروں کو یکجا کیا ہے جو کہیں اور دوسری ان کی تصنیف میں نہیں ملتی۔ ان خاکوں میں مصنفہ نے اردو ادب کی اہم ترین شخصیات پر بے حد اہم اور جاندار تحریریں رقم طراز کی ہیں۔ انہوں نے جہاں ان شخصیات کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے وہی ان کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ حیدر ایک حقیقت پسندانہ شخصیت تھیں۔ وہ سچائی، حق اور مساوات کو پیش کرنے سے کبھی نہیں کتراہی اور جوں کی توں حقیقت بیان کر دیتی ہیں۔ جہاں انہوں نے ان خاکوں میں دوسری اوصاف کو بیان کیا وہی ان شخصیات میں چھپتی ہوئی انسانی ہمدردی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ان عناصر کی نشاندہی بھی کی جو ان شخصیات کے حسن کو دوبالا کرتیں۔ ڈاکٹر مجیب احمد خاں قرۃ العین حیدر کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ چاہیے ناول ہوں افسانہ ہو، سفر نامہ خاکہ ہو، مضمون یا پھر خطوط ہی کیوں نہ ہوں۔ بہر حال سب کے سب مقصد سے مزین۔ دراصل وہ چاہتی ہیں کہ قاری اچھی باتوں کو پڑھ کر یا سن کر اس پر عمل پیرا

ہواور ایک اچھے معاشرے کی تعمیر کرے ۔مگر وہ عہد حاضر کے
زوال آمادہ تہذیبی قدروں میں روز افزوں گراوٹ سے پریشان
رہتی ہیں۔ وہ ان الم ناکیوں کو محسوس کرتی ہیں اور بڑی فکرمند ہیں
کہ شریف انسان کی وہ قدر نہیں ہورہی جس کا وہ محتاج ہے۔''[11]

یہاں تہذیبی قدروں میں گراوٹ سے مراد قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی ہے جو قرۃ العین حیدر چاہتی تھیں کہ ہمارے سماج میں دن بدن کم ہوتی جارہی ہیں۔قرۃ العین حیدر چاہتی تھیں کہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ ہمارے ملک میں قائم رہے جو ملک کی ایکتا کے لئے بہت ضروری ہےقرۃ العین حیدر نے جتنے بھی خاکے لکھےان میں جہاں دوسرے کئی پہلوں کو انہوں نے اجاگر کیاوہیں قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے عناصر کی نشاندہی بھی انہوں نے بہت حدتک کی ہے۔''آئینہ خانے میں وہ اپنے لئے یوں لکھتی ہیں:

'' میں نے محبت ،نفرت ، مذہبی کٹرپن اور بے رحمی کے بارے
میں بہت غور کیا ۔ انسان کی انسان کی جانب بے رحمی۔ انفرادی
اوراجتماعی طور پر اجتماعی بے رحمی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ پھر سامنے
آگیا۔ ملک تقسیم کیوں ہوا۔ کیا یہ تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر
تھی۔اس سوال نے مجھے فلسفہ تاریخ کی طرف کھینچا۔اس کا جواب
دینے کی کوشش میں نے ایک ناول''آگ کا دریا' ' لکھا ۔ دریا کو
زمانہ کا Symbol بناکر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور
الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت

کوگرفت میں لانے کی کوشش کی (وقت کے علاوہ الفاظ میرے
لئے دوسرا مسئلہ ہیں۔) ۱۲؎

قرۃ العین حیدر چاہتی تھیں کہ ملک تقسیم نہ ہو اور قومی یکجہتی کے ساتھ سب ہندو مسلم رہیں۔ مذہبی کٹرپن کو بہت ناپسند چیز تصور کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ ان سب باتوں کی مذمت کی جس سے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے پر آنچ آئے ۔لیکن انسان کو سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اس کے ذہنی تجربے ناقابل حصو ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ میری کہانیوں میں اچھی کردارنگاری نہیں ہوتی کیونکہ ہر انسان کے اندر کتنی تہ در تہ شخصیتیں ہیں کتنے پہلو، کتنے ان دیکھے اور اجنبی راز ہیں۔شاید اسی لئے وہ چوہدری محمد علی ردولوی کے خاکے ''داستان طراز'' میں اودھ کے لئے جذباتی ہوکر یوں لکھتی ہیں کہ:

''اودھ ادب کی وہ بیک گراؤنڈ جس میں اودھ اور صوبہ جات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی زندگی کی ساری گہماگہمی موجود تھی ، اس کی جھلک ہمیں سرشار رسوا اور اودھ پنچ کے فائیلوں میں نظر آتی رہی ہے ۔ ان لوگوں کے ماضی میں طلسم ہوش ربا کی وہ داستانیں بھی تھیں جنہیں آغا مہر کی ڈیوڑھی والے اونچی داستان گومحفلوں میں سنایا کرتے تھے۔'' ۱۳؎

یہاں قرۃ العین نے اس دور کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو مسلم سب ایک ساتھ مل جل کر اکٹھے دن کو دنیاوی کام کرتے تھے اور رات کو بیٹھ کر لمبی لمبی

داستانیں سنا سنایا کرتے تھے ۔ان کی تہذیب میں کسی قسم کی کوئی تفرقہ بازی نہیں تھیں کوئی دکھ درد ایسا نہیں تھا جو ان کا سانجھا نہ ہوایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے ۔ یہاں کی تہذیب سانجھی ہے اس ملک کا ماضی کتنا خوشحال تھا جب اودھ میں ہر طرف خوشحالی اور رنگیں خیالی کا دور تھا۔ لیکن اچانک زمانے نے کروٹ بدلی اور تہذیب میں تبدیلی آنے لگی جس کا قرۃ العین حیدر کو بہت دکھ تھا۔ ان کو اس تہذیب سے شدید جذباتی لگاؤ تھا۔ اور محمد علی دردلوی جن کی شخصیت پر قرۃ العین حیدر نے خاکہ لکھا ان کو بھی اس تہذیب سے بہت لگاؤ تھا جس کو اب آہستہ آہستہ مٹایا جا رہا تھا۔ دن بدن عسائیت کا غلبہ، یورپ کا عروج ، انگریزوں کی سلطنت کا اقبال ، ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں قدم قدم پر یہ کشمکش اور تضاد ان لوگوں کو نظر آتے تھے ۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہماری تہذیب کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں اس کا دکھ محمد علی دردلوی اور قرۃ العین حیدر دونوں کو تھا۔ جس کے متعلق مصنفہ یوں لکھتی ہیں:

> ''یہ زمانے جیسے کے میں نے عرض کیا ۔ شدید جذباتی کشمکش کا وقت رہا ہوگا۔ اس زمانے کا ایک کلچر تھا جس نے لکھنؤ دہلی اور دوآبے کے علاقے کی ایک طرح قلعہ بندی سی کر رکھی تھی۔ ہیومنزم کی چند اقدار تھیں جنہوں نے اس خطے کے کلچر کو جنم دیا تھااور جسے بیرونی مداخلت اور باہمی مذہبی آویزش نے مل جل کر بخوبی ختم کر دیا اور جس کا فائنل اور خوفناک نتیجہ ہم نے 1947ء میں دیکھ لیا ۔ پھر ہمارا عوامی کلچر تھا جو ہم نے اپنے دیہاتوں

اور اپنے قصبہ جات میں دیکھا تھا۔ اور جس کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان روایات پر رکھی گئی تھیں۔اسی تہذیب اوراس اقدار کے ایک نام لیوا چوہدری محمد علی ہیں جن کے بارے میں میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔''[۱۴]

غرض یہ کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے خاکوں میں جہاں کسی شخصیت کے دوسرے کئی پہلوں پر لکھا وہی اس شخص کی مشترکہ تہذیب کی اقدار قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا چونکہ ہمارے ملک گنگ وجمن کے معاشرے کی بنیاد جس تضاد پر قائم تھی وہ طبقاتی تھا مذہبی نہیں تھا۔ ہمارے ان بزرگوں مثلاً پریم چند،محمد علی دونوں کے یہاں پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی موجود ہے۔اس پرانی تہذیب کی بہت سی باتوں سے یہ لوگ نالاں ہیں لیکن اس وابستگی کو چھوڑنے کیلئے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ۔لکھنؤ، دلی اور سارے اودھ کے اجڑنے کا انہیں شدید ذہنی جھٹکا اور روحانی تکلیف ہے ۔ردولی صاحب کے سبھی رشتہ دار پاکستان اور ملک سے باہر دوسرے کئی شہروں میں جا کر آباد ہوگئے ہیں اور کافی خوشحال بھی ہیں مگر ردولی صاحب ہیں کہ یہ جنم بھومی کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔

داستان طراز میں قرۃ العین حیدر نے اسرار الحق مجاز کا بھی خاکہ تحریر کیا ہے انہوں نے اس خاکے میں بہت بڑی عظیم ہستیوں کی بات بھی کی ہے اور مجاز کی شخصیت کو اس طرح اجاگر کیا کہ مجاز کی تصویر آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے ۔مجاز نئی اور پرانی روایت کا حصے تھے اور اس مجاز کی روایت کو قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

''مجاز ہماری نئی روایت کا بہت اہم حصہ ہیں۔ ہماری یہ نئی روایت آج سے بہت عرصہ قبل شروع کی گئی یہ خالص دیسی روایت نہ تھی کیونکہ ہمارے ذہن مغرب کی نظریہ کائنات کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کرر ہے تھے۔ زندگی بہت مشکل بہت پر پیچ اور بہت دکھی بنتی جارہی ہے اور ہمارے اظہار کے لئے نئی علامتیں، نئے اسلوب درکار تھے۔ پرانا طرز بیان اودھ کی آخری دور کے ساتھ رخصت ہوا۔'' ۱۵

قرۃ العین حیدر نے جہاں مجازؔ کی شخصیت اور فن پر اس خاکے میں بات کی ہے وہی ہندوستان کے دوسرے مسائل کو بھی مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں اور سیاسی گفتگو کو بھی اس میں شامل کرتی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''اس سے سارا ہندوستان ذہنی طور پر بہت آگے بڑھ چکا تھا اوراب ٹیگور اور گاندھی کو کسی ایذرا پاؤنڈ اور کسی رومین دوران کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ برطانیہ اور ہندوستان کے متوسط طبقے گاندھی، نہرو، لینن اور گورکی کے ناموں سے چونک اٹھے تھے۔ لیکن پھر بھی، ابھی خطرہ بہت دور تھا اوران کے قلعے بہت محفوظ۔'' ۱٦

مصنفہ اور مجازؔ دونوں اس دور کے پیداوار تھے جب ملک ایک طرف ترقی کی راہ پر گامزن تھا اور دوسری طرف جد وجہد آزاد کی خاطر جنگ لڑ رہا تھا۔ آزادی کی تحریک

زوروں پر تھی اور پورا ملک آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں بہت ترقی ہورہی تھی۔مجاؔز بھی اسی دور کا حصہ تھے جس کا نقشہ مصنفہ نے کچھ اس طرح سے کھینچا ہے۔:

''ہندوستان کی تہذیبی دورزندگی کا یہ نیا دور جس شان سے طلوع ہوا مجاؔز اسی شان سے اس کے لقب بن کر آگے بڑھے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کلکتہ اور پٹنہ اور آلہ آباد اورلکھنؤ اورعلی گڑھ کی یونیورسٹیاں ملک کےعلمی ادبی اورکلچر زندگی کے مرکز بنی ہوئی تھیں۔ جب ملک میں روز ہرطرف نت نئے چراغ جلتے جارہے تھے اودھےشنکر نے رقص کی تجدید وترویج کے لئے الموڑے میں کلچرسینٹر قائم کیا تھا گروپ تھیٹر مومنٹmovement شروع کیا گیا تھا۔ ہندوستان اکیڈیمی الہ آباد نئ نئ کتابیں شائع کرہی تھی عثمانیہ یونیورسٹی میں اور دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں ادب پر ٹھوس کام کیاجارہاتھا............ اس سہانی صبح کے خواب دیکھے جارہے تھے جب قوم ہندو اورمسلمان ، پنجابی اور بنگالی اکٹھے قدم بڑھا کرآزادی کا سواگت کریں گے ۔ ہندوستان کی قدیم ہندومسلم تہذیب کی تجدید کی جائے گی کانپور اور ٹاٹا نگر اور کلکتہ اوربمبئ اور احمد آباد کی ملوں کے مزدور اپنا اپنا جیون شروع کریں گے ۔نئے پن کے اس جوش نے ملک کےنوجوان طبقے میں ایک عجیب طرح

کا والہانہ بانکپن اورسرفروشی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا
کردیا تھا۔''۱۷

قرۃ العین حیدر نے کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کا خاکہ بھی تحریر کیا تھا۔مہندر ناتھ سے قرۃ العین حیدر کی ملاقات غالباً ۱۹۶۵ء میں ہوئی مہندر ناتھ کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں کہتی ہیں:۔

''حسب معمول بے حد ہوحق کی محفل تھی لیکن مہندر ناتھ بہت کم گو معلوم ہوتے ۔ رات گئے عصمت آپا کے انڈس کوٹ اے دوڑ سے کھمبا ٹا بلڈنگ مسز سیال کے گھر پہنچانے کے لئے لوگ ایروس تک پیدل آئے چرچ گیٹ کے چوراہے پر مہندرناتھ نے خداحافظ کہا اور چرمی بیگ سنبھالتے سر جھکائے سنسان سڑک پر فلور فاؤنٹین کی طرف روانہ ہوگئے ۔اس وقت مجھے اچانک خیال آیا اس سارے ہوحق اور ہنگامہ آرائی کے بعد یہاں بیشتر رہنے والوں کی زندگی دراصل یہ ہے ۔مسلسل جدو جہد اور اکیلے راستے۔''۱۸

مہندر ناتھ بھی قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے علمبردار تھے انہوں نے مفلسی کی زندگی گذاری اور کبھی بادشاہ وقت کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے ہمیشہ غریب ،غربا اور بے بس لوگوں کے ساتھ نظر آئے ان کی تحریریں بھی اسی بات کی گواہ ہیں اندر گجرال ان کے اچھے دوست تھے ایک بار مہندر ناتھ کو چال میں دیکھ کرانہوں نے کہا تھا کہ تمہارے

لئے میں ایک فلیٹ کا بندوبست کرادیتا ہوں۔ مہندر ناتھ نے جواب دیا تھا کہ آپ کو میرے لئے ایک نہیں تین سو فلیٹ کا بندوبست کرنا پڑے گا کیونکہ میری طرح کے تین سو ادیب بمبئی میں اسی حالت میں چالوں میں رہتے ہیں اس بات سے وضاحت ہوتی ہے کہ یہاں کس قسم کی بھائی چارگی ہے اگر وہ چاہتے تو خود فلیٹ میں رہتے اور خوشحال زندگی بسر کرتے مگر وہ اپنے دوست اور رفقاء ادیبوں کے ساتھ رہنے چاہتے تھے۔قرۃ العین حیدر نے مہندر ناتھ کی اس بھائی چارگی کو یہاں پیش کرکے یہاں کے لوگوں کی خلوص بھری اور درد بھری زندگی کو پیش کیا ہے۔جس سے بھائی چارگی کے عناصر عیاں ہوتے ہیں۔

مصنفہ نے اسی طرح کا ایک اورخاکہ اس کتاب ''داستان طراز'' میں فیض احمد فیض پر لکھاہے۔جنہوں نے ساری عمر وطنی شاعری کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو فیض نے بھی اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے۔فیضؔ کے بارے میں حیدر یوں کہتی ہیں:۔

> ''ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ فیضؔ صاحب کا دور ہے اور یہ دو رنقش فریادی کی اشاعت کے وقت سے چلا آرہا ہے، فیضؔ صاحب کی کمیونزم، روس دوستی، ''بھارت نوازی''، پنجاب، بے پناہ مقبولیت، یہ تمام چیزیں آپ کو کتنی ہی کھلتی ہوں آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کرسکتے۔اب یہ نوبت آچکی ہے کہ مغرب کے Pop stars کی Groupes کی طرح خواتین

شہروں شہروں فیضؔ صاحب کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔''[19]

یہاں ہندوپاک میں یہ اردو والوں کی روایت رہی ہے کہ کے ان شعراء اور ادباء صوفی سنت سانچے رہے ہیں وہ میرؔ ہوں غالبؔ ہوں یا پھر اقبالؔ اور فیضؔ یہ سب اپنے اپنے دور کے بڑے شاعر مگر ہندو اور مسلم یکساں ان کے مداح ہیں کسی کو کسی پر سبقت حاصل نہیں اس کی مثال بھی قرۃ العین قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے یوں دیتی ہیں:۔

''ایک اردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبالؔ اور فیضؔ پر سردھنتا ہے اس لاشعوری طور پر قبائلی تھرو بیک بھی کارفرما ہے جس طرح اہل پنجاب ہندو مسلمان اور سکھ فیضؔ صاحب کے شیدائی ہیں ۔ یو۔پی ۔ بہار اور دہلی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہوکر کسی واحد ادبی شخصیت کے لئے اس طرح کے والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے ۔ کیونکہ وادی گنگا وجمن کی لسانی اور تہذیبی شنویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستس کی گنجائش نہیں اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جس کے متعلق ہندی اور اردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔''[20]

قرۃ العین حیدر کی اس قسم کی مثالیں دے کر ہمارے ملک وقوم میں ایک مشترکہ تہذیب کی جو روایت ہے اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ اس کوشش میں وہ کسی

حد تک کامیاب ہوتی ہیں یہ ان کی تخلیقات پڑھنے والے سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو متواتر اپنی تحریروں میں برتا ہے ۔ حیدر نے جہاں کہیں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے حوالے سے بات ہوتی اس کی اس بات کو یا اس تحریر کو اپنی تخلیقات میں برتنے کی ضرور کوشش کی ہے ایک جگہ جہاں وہ عصمت چغتائی کا خاکہ تحریر کر رہی ہیں وہاں سروجنی نائیڈو کا ذکر حالانکہ ضروری نہیں مگر ان کی نظم میں جس میں آپسی بھائی چارگی اور قوم یکجہتی کی بات ہے اس کو ضرور تحریر کرتی ہیں:۔

''۱۹۲۶ء میں عمر سبحانی کی وفات پر سروجنی نائیڈو نے ایک دلدوز نظم لکھی تھی۔ ''تم نہ میرے رشتہ دار تھے نہ ہم مذہب ،لیکن اپنے بادشاہوں جیسا دل رکھنے والے تم مجھے اپنے سگے بھائیوں سے زیاہ عزیز تھے ۔ افسوس کہ میں جس نے ہمیشہ تمہاری خودداری غمگین تنہائی کا مذاق اڑانے والے خونخوار کرب کو کم کرنے کی کوشش کی میں ہی تمہاری آخری مصیبت کے وقت تم سے دور تھی ۔ میں تمہارے مزار کے پاس کھڑی تمہیں پکارتی ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔''۲۱

اس سے بڑھ کر اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اور کیا ہوں گے کہ قرۃ العین حیدر عصمت کا خاکہ تحریر کرر رہی ہیں مگر سروجنی نائیڈو کی اس تحریر یا نظر کے ترجمے کو اس میں شامل کرتی ہیں جس میں قومی یکجہتی کے عناصر ہوں۔

قرۃ العین کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ '' پکچر لیگری'' ہے اس کو حیدر نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ دہلی سے ۲۰۰۴ء میں شائع کروایا تھا۔'' پکچر گیلری'' اور داستان طراز میں کچھ

خاکے مشترکہ ہیں اور دونوں میں پیش کئے گئے خاکوں میں قرۃ العین حیدر نے جہاں شخصی خاکوں کے دیگر کارناموں کو ابھارا ہے وہی ان شخصیات میں قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے جیسی پیش قیمتی شئے کو موضوع بنا کر قرۃ العین حیدر نے انسان کے اندر چھپی ہوئی انسانی ہمدردی اور انسانی بھائی چارگی کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ میں قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کے عناصر

رپورتاژ ہمارے اردو ادب میں انگریزی ادب سے آیا ہے ۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے اور انگریزی میں رپورتاژ کو رپورٹ ایج کہتے ہیں۔اس صنف نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں دوسری جنگ عظیم کے دوران اور بعد میں کافی شہرت اورمقبولیت پائی او ر ایک وقت انگریزی ادب میں ایسا بھی آیا کہ یہ صنف دوسری اصناف پر حاوی نظر آنے لگی ہمارے اردو ادب میں سجاد ظہیر کو پہلا مکمل رپورتاژ نگار مانا جاتا ہے۔ اور ''یادیں'' کے نام سے انہوں نے اپنا پہلا رپورتاژ لکھا ہے۔فن رپورتاژ نگاری پر طلعت گل اپنی کتاب ''اردو میں رپورتاژ کی روایت'' میں رقم طراز ہیں:۔

> ''بقول Carey رپورتاژ کا انحصار سچائی اورحقیقت پر ہوتا ہے ۔ رپورتاژ دراصل قاری کو افسانے کی تصوراتی اور روحانی زمین سے الگ کرکے سچائی یا حقیقت کو سخت پتھریلی زمین میں کھڑا

کردیتاہے۔ رپورتاژ نگار اس سچ کو موضوع بناتا ہے جو زندگی کی اصل ڈگر پر چلتے ہوئے اور کبھی کبھی عام ڈگر سے ہٹ کر غیر معمولی انداز میں مصنف کے سامنے آتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ رپورتاژ نگار چند مخصوص صداقتوں، حقائق اور زندگی کے مخصوص تقاضوں کو ہی نقاب کشائی کرے۔ وہ کسی بھی موضوع کو تحریری شکل میں ڈھال سکتا ہے...... اس نے نہ صرف زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہو بلکہ اپنے خدمات کی شدت کو حسن اور سلیقے سے پیش کرنے کا ڈھنگ بھی جانتا ہو۔ رپورتاژ صحافت سے بہت قریب نظر آتا ہے لیکن اس کا فن اس کو خالص رپورٹ سے بالکل الگ کرتا ہے۔'' [۲۲]

قرۃ العین حیدر ''ستمبر کا چاند'' کے دیباچہ میں رپورتاژ کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ رپورتاژ اور سیدھے سادھے سفر نامے میں محض انداز بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں زیب داستان بھی اسی حد تک ہوتی ہے کہ اس سے حقائق کی پردہ پوشی نہ ہو یا واقعات کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے مثال کے طور پر افسانے اور حقیقت کا امتزاج ہمیں یلدرم کے مضمون ''سفر بغداد'' میں ملتا ہے۔ جو ۱۹۰۴ء میں لکھا گیا اور جسے اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے اور اس روداد میں بغداد جانے والے راوی کو راستے میں سندباد جہازی ملتے ہیں جو حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد عالم اسلام کی ابتر حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اچانک غائب ہوجاتے ہیں۔

اردو کا پہلا مکمل رپورتاژ کون سا ہے یہ معاملہ بھی تحقیق طلب ہے۔ یلدرم سے لے کر سجاد ظہیر تک ۔ سجاد ظہیر کا ''یادیں'' کے بعد سلمٰی عنایت اللہ کا رپورتاژ'' ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ''، سلمٰی صدیقی کا ''نقاب اور چہرے''، قرۃ العین حیدر کا ''ستمبر کا چاند'' قدرت اللہ شہاب کا ''اے بنی اسرائیل'' رام لال کا ''احساس کی یاترا'' شاید احمد دہلوی کا ''دلی کی بپتا'' کرشن چندر کا ''پورے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک قرۃ العین حیدر کی رپورتاژ کا تعلق ہے تو حیدر اردو کے رپورتاژ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں ۔ان کے اب تک دس رپورتاژ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوہ دماوند اور ستمبر کا چاند دو رپورتاژ کے مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۲۰۰۰ء میں اور دوسرا ۲۰۰۲ء میں شائع کروائے گئے ۔ لندن لیٹر قرۃ العین حیدر کا پہلا رپورتاژ ہے جو ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا اور اسی زمانہ میں زمانہ نقوش لاہور سے شائع ہوا۔ جہاں تک میرے موضوع کا تعلق ہے یعنی ان رپورتاژ جس قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر تو یہ بالکل صاف ہے کہ ان سفر ناموں میں قرۃ العین حیدر نے مختلف طریقوں سے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے آپسی بھائی چارے قائم رہے۔

قرۃ العین حیدر نے جہاں اپنی تہذیب اپنے ملک میں قومی یکجہتی کی بات کی وہی کئی جگہوں پر اپنی تخلیقات میں اپنی مسلمان قوم کی بات بھی کی ۔ مذہب کے معاملے میں وہ کبھی کافی جذباتی ہوجاتی ہیں اور کبھی بہت ہی نارمل ۔ یہاں میری مراد مذہبی بھائی چارے کی بات ہے کہ وہ کسی بھی ملک کا ان کا ہم مذہبی ہو اس کے تئیں ان کی کافی دلچسپی رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں انہوں نے مسلمانوں کے عروج کے زمانے کو بڑے فخر کے

ساتھ مطالعہ کیا کہ کس طرح ان کے اباواجداد نے دنیا کو فتح کیا۔ ترکی قوم سے حیدر کو والہانہ محبت تھیں جس کو انہوں نے ''لندن لیٹر'' میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

''یہ بیروت ہے۔ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اورقومی جذباتیت کا ایک اور سمبل، کیا شاندار ترک ہے۔ پلونہ اور ادونہ اور سالونیکا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ کوریا سے لوٹ رہاہے اور وہ بھی یواین او کا ایک اہم رکن ہے کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس نے ترک بریگیڈر کا ذکرکیا اورترکی کی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اسے سنایا جو میرے والد کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے مختصراً اس کے گوش گذار کردی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اوراسلام دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا۔۲۳''

قرۃ العین حیدر کی مسلمان قوم کے تیئں اپنی محبت بہت زیادہ تھیں انہوں نے مسلمانوں کی بربادی ۱۹۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اجڑتے گھروں اور خاندانوں کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا اورخود بھی وہ اس تقسیم کا نشانہ بنیں اس سے بھی ان کے دل میں اپنی مسلمان قوم کے لئے جذبہ بڑا۔ اس تقسیم اور غدر کے بعد جب بھی کوئی مسلمان عرب یا کسی دوسرے ملک کا نظر آتا تو ان کے جذبات ہمیں نظر آنے لگتے ہیں

''لندن لیٹر'' میں ایک عرب کو دیکھ کران کے جذبات یوں سامنے آتے ہیں:

'' توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کرر ہاہے...... بہرکیف تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہاہے ۔اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ یہ میرے رسول اللہؐ اور میرے ائمہ کی قوم کا ایک فرد ہے ۔ وہ لوگ بھی اسی شکل صورت کے رہے ہوں گے ۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہاہے۔ جہاں پر میرے امامؑ مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا میرے اوپر کافی جذباتیت کا موڑ طاری ہورہاہے۔ عرب نے کولڈڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھایا ۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی ۔کوکا کولا پیئو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی'' ۲۴؎

مصنفہ نے ہمیشہ قومی مفاد کی بات کی ہے چاہے وہ مذہبی سطح کی ہو یا پھر ملکی سطح کی مگر انہوں نے اپنی تمام تخلیقات اورتحریروں میں بھائی چارے کے عناصر ضرور پیدا کئے ہیں ۔اب مثال کے طور پر رپورتاژ میں مذہبی اورقومی یا ملکی بھائی چارگی کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھیں اگر وہ ان عناصر کو نہ بھی پیش کرتیں تب بھی فنی لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہ پڑتا مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے مفادات سے بڑھ کر ملکی اورمذہبی مفادات کی بات کی ہے۔ جب مصنفہ نے لندن میں ہمارے ملک ہندوستان کی کچھ چیزیں دیکھی تو ان کو بے

حد صدمہ ہوا چونکہ وہ ہمارا تہذیبی خزانہ تھااوران ملکوں نے یہاں سے لوٹ کھسوٹ کر اپنے ملکوں میں ان چیزوں کو لئے گئے تھے۔مصنفہ لکھتی ہیں:۔

> ''انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے نادر نسخے ،مغل تصویریں اورسارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں۔ جس کی دیواروں پر سے میرے گورو ایل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کے جانشین نئے بھارت کی سررنگ بالائیں اپنی دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں ۔تلک جینتی منائی جاتی ہے۔''۲۵

ہندوستان سے جتنے بھی لوگ باہر کے ملکوں میں گئے ہیں وہ اپنے تہوار ضرورمناتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں چاہے وہ عید ہو، ہولی ہو، دیوالی ہو یا پھر تلک جینتی اورتمام ہندوستانی پاکستانی اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ یہاں کے تہوار سانجے ہیں ۔ ہندومسلم اکٹھے ہوکر ہر ایک تہوار مناتے ہیں۔ یہاں سے جتنے لوگ باہر کے ملکوں میں گئے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس رپورتاژ میں ایک خان صاحب کی مثال دی ہے جو پچھلے کئی سالوں سے لندن میں رہتے ہیں جو جوشؔ کے قریبی ہیں اوراپنی ذات میں انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اردوسیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی ۔ بہت لمبے عرصہ لندن میں رہنے کے باوجود ان کا لب ولہجہ ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا تھا۔ اردو بولنے میں ہمیشہ انہوں نے اودھ والوں کا سا لب ولہجہ رکھا۔سنیما کو ہمیشہ انہوں نے بائیسکوپ ہی کہا۔لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں وہ کہانیاں

سناتے تھے ۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے کے لئے وہ برطانیہ گئے تھے اور اس کے بعد کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے ۔ ہائیڈ پارک میں انہوں نے بھی بغاوت کی آواز بلند کی تھی۔ لائیڈ پار کے پاس پہنچ جاتے تھے اوراس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کے آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہندکو فوراً ابھی آزاد کیجئے ۔مصنفہ نے بتایا کہ خان صاحب کو وطن کتنا عزیز تھا مگر جب وہ وطن واپس آتے ہیں تو وہ ملک اب ہندوستان نہیں رہا بلکہ پاکستان نام سے دوسرا ملک قائم کیا گیا اوران کو وطن واپس نہیں جانے دیا گیا جس کومصنفہ یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''اب بوڑھے ہوگئے ہیں اوردل شکستہ ہیں کہ جوسوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے ۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں ۔کوئی خاندان نہیں ہے ۔اکیلے رہتے ہیں اوراپنے محلے بھر کے گورو اورجگت چچا ہیں۔ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چوہدری محمد علی ردولوی کی حکایتوں میں اور چوہدری محمد علی کے قصوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اورسر دھننے والے اب کم رہ گئے ہیں۔''۲۶؎

جس طرح منشی پریم چند کو اردو والے اور ہندی والے اپنا مشترکہ ادیب مانتے ہیں اسی طرح ٹیگور اورگاندھی کی بھی بہت عزت اورحوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان شخصیات کو بھی بڑی قدر اورعظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔مشرقی ہندوستان کے ایک بنگالی مسلمان

ٹیگور کے متعلق یوں کہتے ہیں:۔

''میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا۔ ٹیگور کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟''

''جی؟''

''میرا مطلب ہے کہ ٹیگور بنگال کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس حساب سے ٹیگور بھی پاکستانی شاعر ہوا؟

''دیکھیئے میں عرض کردوں۔میں نے گلا صاف کیا۔ آپ نذرالاسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں۔جس غریب کو پاکستان کے وجود کی بھی خبر نہیں اور کلکتہ میں پڑا زندگی کے دن پورے کررہا ہے تو پھر ٹیگور کو آپ پاکستانی شاعر کیوں نہیں مانتے جب کے آپ کو مغربی پاکستان کے ہر گھر میں قائداعظم کے ساتھ ساتھ ٹیگور کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے مارے اخلاق ٹیگور کے متعلق آپ سے بات کی تو آپ خاموش ہوگئے ۔ اور وہ بے حد کھسیانا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کلچر کی تقسیم کے بعد ٹیگور اور اقبالؔ جیسی عظیم بین الاقوامی ہستیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔''[27]

غرض یہ کہ ہماری تہذیب مشترکہ نہیں بلکہ ہماری تہذیبی ہستیاں بھی مشترکہ ہیں۔

ملک تقسیم ہوا ہم نے ملک کو تو تقسیم کیا مگر تہذیب کو تقسیم نہیں کر سکے ہماری قوم میں بہت سی چیزیں مشترکہ ہیں جس کی وجہ سے ہماری قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ قائم ہے اور جس کی مثالیں قرۃ العین حیدر نے جابجا اپنی رپورتاژ میں پیش کیں ہیں۔''ستمبر کا چاند'' میں ایک جگہ انسانیت کا پرچار اس طرح کرتی ہیں ایک ڈاکٹر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں ، ان کے دکھ ، تکلیف ، مسرتیں ! انسان محبت کرتا ہے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان مرتا ہے ۔ ان سطور میں کس طرح انسانی محبت واخوت کا پیغام حیدر نے دیا ہے آگے ایک جگہ رپورتاژ ''ستمبر کا چاند'' میں یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''وہ عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ انسانیت ایک ہے اور متحد اگر آپ کسی رسمی عقیدے میں یقین نہیں رکھتے تو انسانیت کے ایکے میں یقین رکھتے۔''

اٹلی کے البرٹو موراویا نے کہا:

> '' مشرق وسطیٰ روس چین اور اب جاپان کی سیاحت کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشرق ومغرب کی تفریق بہت غیر واضح ہے اور ان کا اختلاف اقتصادی اور معنی ترقی کی مختلف سطحوں کی وجہ سے ہے ہم لوگ ایک زبردست صنعتی انقلاب میں گھرے ہوئے ہیں مشرق جسے پسماندہ ممالک کے عجیب وغریب نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔پچھلے پچاس سال سے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہے

جومغرب اس سے قبل کر چکا ہے ۔ یعنی زرعی معاشی نظام کی جگہ
صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش ۔''۲۸

قرۃ العین حیدر نے مندرجہ بالا سطور میں ایشیائی قوم کی بات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں یعنی قرۃ العین حیدر علاقائی ، مذہبی ،ملکی اورخطئی سطح پر قومی نظریے کی بات کرتی ہیں۔ جہاں وہ دیکھتی ہیں کہ یورپین اورمغربی ممالک ہمارے ساتھ بھید بھاؤ کرتے ہیں وہاں وہ پورے ایشیاء کی بات کرتی ہیں۔

اسی طرح مصنفہ نے اپنے دوسرے مجموعے ''کوہِ دماوند'' میں جنگ آزادی کے دوران کی بات جب کرتی ہیں تو اقبال سہیل اعظم گڑھی کی نظم کو بھی اپنے رپورتاژ میں لکھتی ہیں کہ کس طرح انہوں نے انگریزوں کو للکارا تھا۔

ستم جو ہوگا تو دیکھ لیں گے کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
بلا سے قزاق آکے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

''چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ'' میں انڈمان نکوبار جزائر کے سفر کے دوران لکھا ہوا رپورتاژ ہے ۔اس میں قرۃ العین حیدر نے جہاں دوسرے موضوعات پر بات کی ہے وہی ہندوؤں کے بھگوانوں کی بات کو بھی قلمبند کیا ہے کیونکہ ان جزائر سے ہندوؤں کی مذہبی وابستگی ہے ۔مثلاً ایک جگہ مصنفہ یوں رقمطراز ہیں:۔

''ہنومان جی اپنے بندروں سمیت یہاں بھی پہنچے تھے
؟ بھائی نے گارڈ کے حوالدار رام چندر سے پوچھا۔ جوفیض آباد

یعنی اجودھیا کا باشندہ ہے۔ جی ہاں بابا۔ کون جانے لنکا تک
پل بناتے بتاتے کودتے بھاندتے یہاں بھی آ گئے ہوں۔
بجرنگ بلی ہی جو ٹھہرے ۔آ کھر ایک سنجونی بوٹی کھا کر بھگوان
نے سارا پہاڑ ایک ہتھیلی پر اٹھا لیا تھا کہ نہیں؟ ہمیں تو لگتا ہے
گسے میں آ کر ان جوالا مکھی پہاڑوں کو بھی انہوں نے ساگر میں
ڈبو دیا۔''۲۹

مصنفہ نے ان رپورتاژ میں جہاں وہ گئیں وہاں کے موسم ، سیاست ،عوام کی بات ان کی مشکلات کی بات کی وہی اس ملک کی تاریخی اہمیت پر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ یعنی لنکا کی مذہبی اور تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جب راون سینا کو اجودھیا سے لئے کر لنکا بھاگ گیا تو رام جی نے لنکا میں جا کر اسے مارا اور سیتا کو چھوڑا کر واپس لایا۔ یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ ہندوستان سے لنکا تک رام جی نے ایک بہت لمبا پل بنوایا تھا اور ہنو مان کی ایک پوری فوج رام چندر کے ساتھ تھی۔ جس نے لنکا کو فتح کیا تھا۔ یہ تو ہوئی مذہبی بات جوان جزائر کے ساتھ جڑی تھی اس کے بعد تاریخی بات یہ ہے کہ پہلے ہمارے ملک میں جب انگریز آئے تو وہ بھی سمندری راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ۔اس وقت ہمارے یہاں بحری فوج اور سمندری خطرے سے نپٹنے کے لئے کوئی حکمت عملی موجود نہیں تھی۔ حیدر علی اور ٹیپو سے قبل ، دہلی کے مغلوں اور بنگال کے نوابوں کو یہ خیال کبھی ذہن میں نہ آیا کہ بحری طاقت بھی کوئی شئے ہوتی ہے ۔حیدر علی نے سب سے پہلے ہندوستان میں نیوی (سمندری فوج) بنائی اوراس کے بیٹے ٹیپو

سلطان نے مالدیپ میں بحری ہیڈ کوارٹرز قائم کئے مگر اس وقت تک انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے پاؤں جمالئے تھے اور حیدعلی اور ٹیپو کی حکمت عملی سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اگر ان جزیزوں کی حفاظت سولھویں صدی میں کی گئی ہوتی تو انگریز اتنی آسانی سے ہمارے ملک میں نہیں پہنچتے ۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ حیدر کتنی ذہین خاتون تھیں۔ انگریزوں کی یہاں آنے کی پوری تاریخ مصنفہ نے اس رپورتاژ میں رقم کردی ۔ آگے اس رپورتاژ میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''لیکن انگریز کا اقبال بھی کیا شئے ہے صاحب جہاں پہنچتا ہے وہاں گلزار کھلا دیتا ہے۔ اب ان جزیروں پر خالص ولایتی ناموں والے یا رونق اورخوبصورت شہر آباد ہیں۔ پورٹ کارنوالس۔ ایلفٹن ہاربر۔ پورٹ کیمپ بل۔ جیسے اپنے یہاں منٹگمری۔ ڈلہوزی۔کیمبل پور۔''۳۰

قرۃ العین حیدر نے جہاں سیاسی، سماجی ،مذہبی ، تاریخی وغیرہ باتوں کو اپنے رپورتاژ میں موضوع بنایاہے وہی وہ قدرت کے قانون اورقدرت کے اس نظام کو کچھ یوں بیان کیاہے:۔

> ''ہمارا اس نظام سے کیا سمجھوتہ ہے ؟ سمجھوتے کے کیا معنی ہیں۔ ہم سب ساری دنیا ساری اقوام ،نسلیں ، مذہب ،فرقے ، طبقے ،ممالک ، اقرار ہمارے خیالات،نظریے ،تعصّبات، فلسفے ، ادبیات ، علوم وفنون ، ہماری مختلف الٰہیات ، روحانی اورجذباتی

تجربات، سیاسی، سماجی، تمدنی مسائل، ہماری اجتماعی اور انفرادی شخصیت ہماری خامیاں اور ہماری خوبیاں، دشمنی اور دوستی، فتح وشکست، کمال اور زوال، دکھ اور سکھ، حسب نسب تاریخ کی وجوہ کے گنجلک دھندے، روشن، واضح اور غیر واضح تفاعل کی پیداوار ہیں۔''[۱۳]

مدرجہ بالا سطور میں مصنفہ نے ان سب افعال کو واضح کیا ہے جن کے ذریعے ایک انسان کے رشتے دوسرے انسان کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کس طرح پہلے انسان اس کے بعد مذہب اس کے بعد ملک، قوم، نسل، طبقے، فرقے، علاقے ان سب سے انسانی رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارے ملک میں مغل سلطنت سے قبل بہمنی دور تھا جس میں اردو زبان کی پروان اور داغ بیل شروع ہوئی اس کے بعد وہ سلطنت تقسیم ہوئی اور پانچ ریاستی قائم ہوئی۔ مزید آگے اور تقسیم کاری ہوئی اور ہر شخص کو اپنے علاقے سے محبت واخوت تھی جب قرۃ العین حیدر نے دکن کا سفر کیا اور واپسی پر ایک رپوتاژ ''دکن ساٹھا رنہیں سنسار ہیں'' تحریر کیا تو اس میں وہ ان ریاستوں کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

''گلبرگہ تھا اوراس کے آگے بیجا پور اور بیدر اورآگے احمدنگر چاند بی بی، بیجا پور کی چاند سلطانا ئیں ارا کاٹ کے چندا صاحب۔ حیدر آباد کی چندا بھائی مہ لقا۔ اور آج کی چاند پاشائیں، جو آتا ہوں بولتی ہیں۔ اور جنوبی رقص بھرت نائیم کی

ماہر جنوب کی وحیدہ رحمان جن کو ان کی بھانجیاں چاند خالہ پکارتی ہیں۔ جنوب میں شاہد ہر چوتھی لڑکی کا نام چاند ہے ۔''۳۲

اس اقتباس میں مصنفہ نے دکن سے اپنی وابستگی اور دلگی کا اظہار کیا ہے کہ کس طرح دکن جو قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے مشہور تھا کسی ایک عظیم شخصیت کے نام سے لوگوں کو اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے نام بھی لوگ اسی نسبت سے رکھتے ہیں دکن جو کہ ایک تہذیب تھی جب اجڑی تو اس کا غم پورے ہندوستان کو برابر ہوا اس میں چاہے ہندو تھے یا مسلم یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اسی طرح جب آصف جاہی حیدرآباد کا خاتمہ ہوا اور جب یہ خبر لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس پہنچی تو حیدرآبادی شاعرہ ، بلبل ہند، مہاتما گاندھی کی دست بدست، جوشیلی قوم پرست، قومی رہنما ، سروجنی نائیڈو پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور بولی ہائے میرے بادشاہ کو تخت سے اُتار دیا۔

مطلب یہ کہ لوگوں میں کس قدر بھائی چارگی تھی جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنے رپورتاژ میں دکھایا ہے ۔ مصنفہ نے جہاں کہیں بھی غیر افسانوی ادب میں لکھا اس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کے عناصر کو ضرور شامل کیا اور یہی ان کی پہچان بھی ہے کہ انہوں نے ملک وقوم کو توڑنے کے بجائے جوڑنے کی بات کی ہے۔

حواشی

نام کتاب	مصنف	پبلی کیشنز	صفحہ
۱۔ گل صد برگ	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۱۴
۲۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۱۴۔۱۵
۳۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰
۴۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰
۵۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۴۹
۶۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۵۸
۷۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۹۷۔۹۸
۸۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۹۸
۹۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۹۸۔۹۹
۱۰۔	ڈاکٹر مجیب احمد خان	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۱۰۰

ذات وصفات۔ڈاکٹر مجیب احمد خان)

نام کتاب	مصنف	پبلی کیشنز	صفحہ
۱۱۔ داستان طرز	قرۃ العین حیدر	ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی	۵۸
۱۲۔ داستان طرز	قرۃ العین حیدر	ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی	۳۱۔۳۲
۱۳۔ داستان طرز	قرۃ العین حیدر	ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی	۵۷
۱۴۔ داستان طرز	قرۃ العین حیدر	ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی	۵۸

۱۱۵ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۷۶

۱۶ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۷۷

۱۷ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۷۷۔۷۸

۱۸ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۱۲۔۱۱۳

۱۹ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۳۰

۲۰ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۳۳

۲۱ داستان طرز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۷۱

۲۲بحوالہ ڈاکٹر مجیب احمد خان ،قرۃ العین حیدر(ذات وصفات) کاک آفسیٹ پرنٹرس۷۶۔۷۸

۲۳ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۲

۲۴ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۱۔۱۲

۲۵ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۶

۲۶ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۲۸

۲۷ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۴۸

۲۸ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۹۲

۲۹ کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۲

۳۰ کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۴

۳۱ کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۱۵

۳۲ کوہِ دماوند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۷۴

باب پنجم

حاصل مطالعہ

قرۃ العین حیدر صف اول کی ادیبہ رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک سے بڑھ کر ایک تخلیق وجود میں لائیں جس کی علمی وادبی حلقوں میں ہر طرح سے سرہانہ کی گئی۔ انہوں نے اپنی ان تخلیقات میں جہاں اعلیٰ طبقہ کو موضوع بنایا وہی نچلے طبقے کے لئے بھی ضرور کچھ نہ کچھ لکھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جائے کہ انہوں نے انسانوں کی عظیم ٹریجڈی لکھی ہے۔ اس ٹریجڈی میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں جابجا ان کی ادبی وعلمی سرگرمیوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ عناصر حیدر کو ورثے میں ملے ہیں۔ جب سے اردو ادب کی تاریخ ملتی ہے تب سے لیکر آج تک ہمیں قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہر ادیب اور ہر قلم کار کے ہاں ضرور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اردو زبان کے بھائی چارے کی ابتداء اور اس کے ارتقاء میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ ان صوفیائے کرام میں حضرت محی الدین چشتی، حضرت نظام الدین ،امیر خسرو، ملا وجہی، کبیر اور گرو نانک وغیرہ شامل ہیں جن سے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بنیاد رکھی اور بعد کے تمام ادیبوں نے کسی نہ کسی صورت میں ان عناصر کو اپنی شاعری ونثر میں شامل کرتے رہے۔

قرۃ العین حیدر نے جہاں اپنی تخلیقات میں دیگر عناصر کی نشاندہی کی وہی انہوں نے عورت کے مسائل کو بھی اجاگر کیا۔انہوں نے اپنے کئی افسانوں اور ناولوں میں اپنے معاشرے کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے عورت کے کردار کے علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ جن میں سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو، پت جھڑ کی آواز، میں نے لاکھوں کے بول سہے، نظارہ درمیان ہے وغیرہ وغیرہ ان تمام کہانیوں میں انہوں نے

عورت کو موضوع بنا کر اس کے مسائل کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں و دیگر تمام تخلیقات میں وطن دوستی، قومی یکجہتی، مسائل تقسیم، سماجی نابرابری، فرقہ وارانہ فسادات تمام مسائل پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے فلیش بیک کی تکنیک کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ انہوں نے پہلی بار ''شعور کی رو'' کی تکنیک کا مکمل استعمال اپنی کہانیوں میں کیا۔ ان سے پہلے سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں اس تکنیک کا تجربہ کیا ہے۔ مگر وہ پوری طرح اس تکنیک کو برتنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے جب اپنا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا تو انہوں نے اس تکنیک کو استعمال کیا مگر یہ ابھی ان کا ابتدائی دور تھا اس لئے یہ تجربہ اتنا زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر جب اُن کا دوسرا ناول ''آگ کا دریا'' شائع ہوا تو ادبی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اس سے پہلے اس تکنیک کو کوئی بھی قلم کار اس کامیابی کے ساتھ استعمال نہ کر سکا تھا۔ قرۃ العین حیدر کے ان کارناموں کے سراہنا کرنے والے ہر مذہب اور ہر زبان کے لوگ شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں، افسانوں اور رپورتاژوں کو دوسری زبان مثلاً انگریزی، ہندی، پنجابی، تلگیو، مراٹھی، تمل میں ترجمے کئے جن سے قرۃ العین حیدر کا دائرہ بہت وسیع ہوتا گیا اور ہر ادبی رجحان اور تحریک میں ان کا نام شامل ہوتا گیا۔

قرۃ العین حیدر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ادبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے تخلیقی کارنامے اس بات کی دلیل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی زبان، اسلوب تحریر اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر عظیم فنکارہ تھیں۔ تاریخ کا اس

قدر مطالعہ تھا کہ بڑے بڑے تاریخ داں اُن جیسا شعور نہیں رکھتے ۔ مثلاً ''آگ کا دریا'' میں جو ویدک عہد کو پیش کیا گیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مصنفہ صرف اسلامک تاریخ ہی نہیں بلکہ ہند دیوملائی عناصر اور ہندی تاریخ سے بھی روشناس تھیں۔ ویدیک کے بعد اسلامک عہد ہے، جس کی نمائندگی کمال الدین کرتا ہے اوراس کے بعد انگریزی عہد جس عہد کو قرۃ العین حیدر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور آزادی کے بعد کی دنیا کو انہوں نے صرف ایک ناول میں سمیٹا ہوا ہے ۔ حیدر نے اپنے ناولوں اورافسانوں میں اچھوتے تجربے کیے ہیں۔ ان کی اس کوشش سے نہ صرف ہمارے ادب میں اضافہ ہوا بلکہ فکشن کا میدان بھی اور زیادہ وسیع ہوگیا۔

''قرۃ العین حیدر کےتخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر'' کے عنوان کے تحت میرا تحقیقی مقالہ پیش خدمت ہے ۔قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کی اگر بات کی جائے تو لفظ قوم اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے ۔ لفظ قوم ،مبہم طور پر اور بڑی حد تک غیر متعین معنون میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں قوم سے مراد کبھی کسی ایک گروہ میں رہنے والے ، ایک ساتھ زندگی گزارنے والے ، کسی ایک سیاسی جماعت کے تحت کام کرنے والے ، کبھی کسی ایک نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے ۔ مطلب یہ کہ قوم کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہے بلکہ جیسے کسی کو ضرورت پڑی اُس نے اس لفظ کا استعمال کیا۔ جئے پرکاش نارائن کے مطابق قوم کا وہ شعور جو دورِ حاضر میں ہے کب پیدا ہوا اس کی نشاندہی کرنا بہت مشکل ہے ۔ دورِ حاضر کا نظر یہ عہد قدیم سے میل نہیں کھاتا ، جس عہد میں ملت یا سنتان کے معنی قوم سے مراد تھے۔

ماضی میں قوم سے مراد جرمنی اورفرانس میں حکمران طبقہ کے لئے لی جاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس سے مراد کسی ملک کے باشندے سے لی جانے لگی۔ میک آئیو کے خیال کے مطابق قومیت مشترکہ جذبہ اور ایک دوسرے وابستگی کے ایسے شعور کا نام ہے جسے ایسے تاریخی حالات نے جنم دیا ہے۔ جنہیں مشترکہ روحانی ورثہ ملا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دوقومیں تخلیق کیں۔ ایک قوم مٹی سے مثلاً انسان اور دوسری قوم آتش سے یعنی فرشتے۔ وہاں سے آگے پھر آہستہ آہستہ قوم کا تصور بنتا گیا اور دورِ حاضر میں کبھی کسی ملک کے رہنے والے اور کبھی کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کوقوم مراد لی جانے لگی۔

تاریخ گواہ ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکارنہیں کرسکتا کہ انسان نے اپنے وجود سے لیکر آج تک بہت جنگیں لڑی ہیں اور ہر جنگ کے بعد اس نے ایک دوسرے کے ساتھ صلح کی اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ قائم کیا ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا یکجہتی اور بھائی چارگی کی دلیل ہے۔ تاریخ انسان ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی انسان میں بنیادی طور پر موجود تھی۔

جہاں تک اُردو ادب میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی بات ہے تو اس کی مثال اُردو کے آغاز سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اُردو کا آغاز شمالی ہند سے ہوا مگر پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہیں۔ ان کا دیوان اگر ہم دیکھیں تو اس میں جہاں انہوں نے شب برات اور عید کی بات کی ہے وہاں وہ بسنت اور دیوالی کونہیں بھولے۔ خسرو اور ملاوجہی کی اگر بات کریں تو وہ دونوں صوفی بزرگ تھے۔ ان کے ہاں جہاں مسلم آتے تھے

وہیں ان کے دربار میں ہندو بھی برابر شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے بھی دیروحرم اور مسجد مندر کا مشترکہ تلامذہ اردو شاعری اوراردو نثر کو دیا۔ اس کے بعد ولیؔ، میرؔ، غالبؔ، سرسید، محمد حسین آزاد، میرامنؔ اور نظیر اکبر آبادی کی ادبی خدمات میں برابر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود ہیں۔ الطاف حسین حالیؔ نے جدید اردو ادب میں قومی یکجہتی کا سب سے نمایاں عنصر ''حب وطن'' جیسی شاہکار نظم لکھ کر دیا ملک کی آزادی کے لئے حب الوطنی کے کئی ترانے لکھے گئے جو پورے ہندوستانیوں کی زبان پر رہے۔ اس سلسلے میں ہمارا اُردو ادب کسی دوسری زبان یا ادب سے پیچھے نہیں۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد، پریم چند، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، جوشؔ چکبست، اقبال جیسے قادرالکلام شعراء اور ادباء پیدا ہوئے جن کے شعر وادب میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر جابجا موجود ہیں۔

ان فنکاروں کے بعد بیدی، کرشن چندر، عصمت، منٹو اور قرۃ العین حیدر کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اپنی تخلیقات میں پیش کئے مگر جس قدر قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں ان عناصر کو برتا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

1947ء سے پہلے ہزاروں سال پرانی تہذیب یہاں کی جس میں آپسی بھائی چارے کے عناصر موجود تھے اس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ خود اس مشترکہ تہذیب میں پلی بڑھی تھی وہ خود اس تہذیب کا حصہ تھی۔ اس لئے وہ اپنے ناولوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب قرۃ العین حیدر نے ہوش سنبھالا اس وقت چند ایک عناصر مشترکہ تہذیب کو زک پہنچا رہے تھے

اورآہستہ آہستہ وہ اس سازش میں کامیاب بھی ہوئے اور نتیجے کے طور پر ملک تقسیم ہوگیا اس بات کا احساس قرۃ العین حیدر کو شدت سے تھا۔

انگریزوں نے ہندوستان پر دو ڈھائی سو سال حکومت کی یہاں کی دولت کو لوٹا یہاں کے لوگوں پر ظلم وزیادتیاں کیں طرح طرح کے طریقوں سے یہاں کی دولت اور جائیداد کو نقصان پہنچایا۔ یہاں کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو نقصان پہنچایا مگر پھر بھی یہاں کے لوگ ان کے ساتھ بھائی چارہ بنا کر رکھتے تھے اس کی کئی مثالیں بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں دی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح یہاں کے لوگ انگریزوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ یہاں اس ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں ایک کردار حفیظ احمد کی بیوی کرسٹابل کو جب رخشندہ انگلستان روانہ کرنے کے لئے بمبئی آئی ہے اور جب اس کو الوداع کرتی ہے تو کرسٹابل کچھ اس طرح سے الوداع کرتی ہے:۔

''............خداحافظ............ اُنہوں نے کہنا چاہا............ خدا حافظ برطانیہ کی کرسٹابل ڈورین............ ہم تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم تمہارے جلانے کے لئے لالہ رُخ اورغفران منزل کے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے جی بھر کے تمہاری قوم کو گالیاں دیا کرتے تھے، اب تم جارہی ہو اس لئے کہ ہم نے تمہیں نظر انداز کر کے خود ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کردی ہیں۔لیکن کرسٹابل ڈورین......انہوں نے کہنا چاہا''[1]

ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب سے انگریز بھی بہت متاثر ہوئے مندرجہ بالا سطور میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب کرسٹابل رخشندہ کے گھر میں آتی تھی تو یہ سب لوگ ان کی خاطر کرتے تھے حالانکہ کرسٹابل کو جاتے وقت اس بات کا احساس ہوگیا کہ میں غلط کرتی تھی ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا مگر یہ سب یہاں کی بھائی چارگی سے متاثر ہوکر کرسٹابل کہتی ہے کہ میں تم لوگوں کے دل جلاتی تھی ۔ کسی بات کا اعتراف کرلینا ہی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے اور قرۃ العین حیدر نے کردار کرسٹابل کے ذریعے یہ بات انگریزوں سے بھی قبول کروائی کہ وہ غلط کرتے تھے ۔ کرسٹابل یہاں ایک عورت ہی نہیں بلکہ پورے انگریز طبقے کی نمائندہ کردار اور نمائندہ عورت ہے۔

وقت کا فلسفہ قرۃ العین حیدر کا محبوب فلسفہ رہا ہے جو'' میرے بھی صنم خانے'' اور اس کے بعد آنے والے تمام ناولوں میں اس فلسفہ کو مخصوص موضوع کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے ۔ یہاں کچھ مثالیں ہیں قرۃ العین حیدر کی جو انسانوں کو وقت کے ذریعے نصیحت دینے کی کوشش کرتیں ہیں:۔

> ''ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوسکتے ۔ نئے دن آتے ہیں نئی راہیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے ، آندھیاں اٹھتی ہیں کسی کو موت آتی ہے ، کسی کو نہیں آتی نیند بھی نہیں آتی۔ یہ چکریوں ہی چلتا رہے گا۔''[۲]

ایک اور جگہ آگے یوں رقمطراز ہیں:۔

''زندہ رہنے کی خواہش ، خوش رہنے کی خواہش ، زندگی کی مقناطیسی رو وقت کے ریگستانوں میں کھو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے ،معصوم ، بے بس انسان ،آنے والے دن اور آنے والی راتیں ان سب کے لئے کیا لائیں گی؟ ان کی آنکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں گی ؟ ان کے دل کیوں دھڑکیں گے؟ کوئی نہیں جانتا یہ سب کیوں ہے؟ ارے میں تو فلسفی ہوگئی ہوں بڑی بھاری، اس نے سوچا۔''[۳]

'' وقت ارجن کے خدا کی طرح اپنے شاہکاروں کو خود تباہ کر دیتا ہے ۔مگر وقت ابدیت سے علیحدہ صرف مستقبل پر بھروسہ رکھتا ہے اور مستقبل میں اگر ایسی بن جائے جس میں ہمیں اتنی تمنا ہے تو پھر کوئی بات ایسی ہوگی ، کوئی وجہ ایسی نکل آئے گی جس سے انسانیت کی ساری کوششیں بیکار جائیں گی''[۴]

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پہلی جنگ عظیم سے لیکر تقسیم ہند تک کے دور کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس لئے تقسیم ہند سے پہلے یہاں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں دیکھنے کو ملتے تھے مگر جب ملک تقسیم ہوا اور یہاں خون کی ہولی کھیلی گئی بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہوگیا۔اس وقت کے جتنے بھی ادیب قلم کار تھے انہوں نے اپنی قلم کے ذریعے اس بات کی شدید مذمت کی اور اپنی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو سب نے برتا ۔قرۃ العین حیدر بھی ان میں سے ایک

تھی لہٰذا انہوں نے اس ناول کے ذریعے جہاں سماج کے ٹھیکیداروں پر کڑی تنقید کی وہی اپنی تخلیقات میں اورخصوصاً اس ناول جو اس وقت زیرقلم تھا کہ ذریعے کچھ اس طرح قومی یکجہتی اور آپسی بھائی کے عناصر کو پیش کرنے کی کوشش کی:۔

> ''سب اسی دھرتی کے بیٹے تھے ۔ ان کی زبان ، ان کا لب ولہجہ ان کے گیت ان کے دکھ سکھ ، وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے ، یہ سب اس کا اپنا تھا۔ اس کا اپنا اور بہت پیارا ، اپنی زمین اپنی گیہوں کی بالیاں، ہوا کی نمی ،مٹی کی خوشبو ، یہ سب اس کی اپنی مٹی کے دیوتا تھے۔'' ۵؎

مندرجہ بالاسطور سے واضح ہوجاتا ہے۔ کہ اس دھرتی سے ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو بہت پیار کرتا تھا۔ اس کو اپنی اس مٹی سے کتنی محبت تھی یہاں قرۃ العین حیدر نے کسی مذہب یا کسی فرقے سے تعلق رکھنے والے انسان کونہیں بتایا بلکہ ان کی مراد یہاں کے شہری تھے ۔ یہاں کے لوگوں کے گیت سانجھے تھے یہاں کی زبان سانجھی تھی ۔ یہاں کے لوگوں کے پکوان ایک تھے ۔ ظاہر ہے جب سب کچھ ایک جیسا ہوگا تو ملک میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ ہوگا ۔ تقسیم ہند سے پہلے یا اورتھوڑا پہلے اگر ہم انگریزوں کی آمد سے پہلے دیکھیں تو ہمیں مشترکہ تہذیب کے عناصر ملتے ہیں کہیں پر بھی لڑائی ، فتنے ، فساد مذہبی سطح پر ہمیں دیکھنے کونہیں ملتے تھے ۔ ہندو مسلم سب مل جل کر رہتے تھے جس کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''میرے بھی صنم خانے''میں کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:۔

''یہاں کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کون ہندو ہے، کون مسلمان ہے، کون شیعہ، کون سنی ہے اپنے دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود زندگی بڑی مکمل، پرمسرت اور قانع تھی۔ پرانی روایات کی پابندی اور قدیم چلن کو نبھانا سب کا مقدس فریضہ تھا۔''۲

اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کو اس ناول میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اودھ کی مشترکہ تہذیب اور بھائی چارگی پورے ملک میں بہت مشہور رہی ہے اور آج بھی ہے۔ فسادات کے وقت میں بھی وہاں کچھ حد تک لوگوں نے اس بھائی چارگی کو قائم رکھنے کی کوشش کی جس کو قرۃ العین حیدر نے اودھ کے وفادار کائستھ لالہ اقبال نرائن کے ذریعے اس ناول میں پیش کیا ہے جس کو اپنے رشتہ دار مسلمانوں سے ناطہ توڑنے اور مسلمانوں سے تعلقات نہ رکھنے کی دھمکیاں دیتے ہیں مگر لالہ پر ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ فسادات کے وقت وہاں مسلمانوں کے بھرپور مدد کرنا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی ایسے واقعات ہوتے ہیں جس کے ذریعے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لالہ اقبال نرائن جیسے اور کتنے کردار ہوں گے جنہوں نے قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی روایت کو برقرار رکھا ہوا۔ قرۃ العین حیدر نے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی کے عناصر موجود ہیں۔

اسی طرح سفینۂ غم دل میں بھی حیدر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی عکاسی کچھ اس طرح کرتی ہیں:۔

''شدھ، سناتن دھرم ہندوؤں کے بازار، مسلمان جو لاہوں

کے محلوں ، انگریز حکام کی کوٹھیاں ، دریا کے پرے ان سب پر صبح
کی کاسنی دھند چھائی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کی طویل عمارات ،
سارناتھ کا ابدی سکوت ، جونپور اور قنوج کے تیز سرخ گلابوں کے
تختے ، آم کے باغات ۔''ے

'سفینۂ غم دل' میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پہلے تو یہاں ہندو مسلم ہی رہتے تھے مگر آہستہ آہستہ انگریز بھی یہاں کی تہذیب میں داخل ہوتے ہیں وہ یہاں اپنی کوٹھیاں بھی بنواتے ہیں اوراعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ تعلقات بہت اچھے رکھتے ہیں حالانکہ اُن کا ہندوستان پر قبضہ کرنے کا مقصد تھا مگر یہاں پر اُنہوں نے بھائی چارہ بھی بنایا ان کے حق میں مفید تھا لہٰذا انگریز حکمرانوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں یہاں کے رسم ورواج یہاں کے رہن سہن کو اپنایا اور اس ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا حصہ بننے کی کوشش کی۔ انگریز بھی یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے سے بہت حد تک متاثر ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اس بھائی چارے پر سیاست رچائی اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور یہاں کے بھائی چارے کو انھوں نے توڑا اور نتیجتاً ملک تقسیم ہوا، تہذیب تقسیم ہوئی یہاں کا سب کچھ تقسیم ہوا اورقومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کونقصان پہنچا۔جس کی مثالیں قرۃ العین حیدر کے اس ناول میں بھی موجود ہیں۔

بنیادی طور پر انگریز حکمرانوں کو یہاں کی تہذیب یہاں کے کلچر اور یہاں کی عوام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بلکہ دلی طور پر وہ یہاں کے عوام سے نفرت کرتے تھے مگر تھوڑا

بہت رکھ رکھاؤ کرنا اُن کی مجبوری تھی۔بعض انگریز کو یہاں کے لوگوں سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ ہندوستان میں رہنا پسند بھی نہیں کرتے تھے جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''ان ہندوستانی رجواڑوں کے مسخرے پن سے مسز کیتھلین چیو کو وحشت ہوتی ہے۔''[۸]

سفینۂ غم دل میں قرۃ العین حیدر نے جس طبقے کی عکاسی کی ہے اس میں دو طرح کے لوگ رہتے تھے اس میں ایک فیوڈل طبقہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام ختم ہو وہ برابر انگریزو کی حمایت کرتا تھا وہ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے اور دوسری طرف اسی طرح کا ایک طبقہ آزادی کی جد وجہد میں حصہ لے رہا تھا وہ انگریزوں کی سخت مخالفت کرتے تھے اورعدم تعاون کی تحریک چلا رہے تھے ۔ یہ سب لوگ مل جل کرقومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ یہ کام کررہے تھے ان میں مذہب وملت کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔مگر انگریزوں نے نہ ہی تو ان لوگوں کی کچھ پرواہ کی جو ان کے ساتھ چلتے تھے اور نہ ہی جدو جہد آزادی والوں کی ، انہوں نے صرف ''دوقومی نظریہ'' کے تحت قوم کوتقسیم کیا اور یہاں اس سازش میں وہ کامیاب بھی ہوگئے اورصدیوں سے چلی آرہی مشترکہ تہذیب کا انہوں نے بٹوارا کردیا۔مصنفہ اس بات کو کرداروں کے ذریعے یوں پیش کررہی ہیں:۔

''پھر یک لخت ساری فضا دھوئیں سے معمور ہوگئی ،بلوائیوں کی ہاہا کار، زخمیوں اور دہشت زدہ انسانوں کی چیخیں، زندگی روشنی اور

امید کا خاتمہ، محض تباہی ۔ دم گھوٹ دینے والے دھویں کے بگولے
ہی زندہ ہیں۔ مدھم اجالا تھا۔ جس میں رفتہ رفتہ سارا منظر عیاں
ہوگیا۔ دماغ جو ماؤف ہوگیا تھا کام کرنا شروع کیا۔ یہ سامنے جلے
راکھ کے ڈھیر پڑے ہیں۔ یہ'' آشیانہ'' جیسے میرے باپ نے
مدتیں گذری بڑے چاؤ سے تعمیر کروایا تھا اور آج وجون ہے اور
آج اس سے بالآخر ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ لیا۔[9]

پرانی روایات پرانی قومی یکجہتی مشترکہ تہذیب اور بھائی چارے کی جو مثالیں تقسیم سے
پہلی ملتی تھی وہ سب ختم ہوگئی ۔سب فنا ہوگیا ہاں صرف اتنا رہا کہ ان سب باتوں کو یاد کیا
گیا جس کو قرۃ العین حیدر نے بھی کچھ اس طرح سے رقمطراز کیا ہے:

''یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے
۔ باوقع خوشحال اور باعزت ۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک
سے تھے ۔ رنج اور خوشیاں مسائل یکساں تھے ۔ ان کے فرنیچر اور
باغوں کے پودے ۔ ان کی کتابیں، ان کے لباس سب چیزیں
ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم ان کے نام ان کی دلچسپیاں۔''[10]

مندرجہ بالا مثال سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی
چارے کے عناصر بہت زیادہ تھے ۔ اس مثال میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے رہن
سہن کلچر زبان ، مکان، لباس، کھانے ، رسم ورواج سب ایک تھے مشترکہ تہذیب تھی جس
کی نمائندگی قرۃ العین حیدر کرتی رہی ہیں۔

صدیوں سے ہمارے ملک ہندوستان میں روایت رہی ہے کہ بڑوں کو عزت دینا اور چھوٹوں کو شفقت کے ساتھ پیش آنا یہ سب یہاں کی مثال رہی ہے ان سب چیزوں کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں خوب برتا ہے اور یہ سب بنانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یہاں بھائی چارگی عرصہ قدیم سے قائم رہی ہے ۔ ہر انسان فطری طور پر آزاد ہے اور یہاں ماضی میں بھی دوسرے کی آزادی چاہئے وہ بڑا ہو یا چھوٹا آسے اپنی بات کہنے اور سننے کا حق رہا ہے جس کو قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:۔

> ''آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا ۔ ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا ؟ آنند اسرار جو تم پر منکشف ہوئے وہ سوائے تمہارے اور کون جانے گا ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے ۔''[11]

قرۃ العین حیدر نے مشترکہ تہذیب میں پرورش پائی جب وہ جوان ہوئی تو ملک انگریزوں سے آزاد ہوا ۔ ہمیں آزادی تو ملی مگر ملک کے دو حصے ہوئے، ملک بھی تقسیم ہوا ۔قتل و غارت کا ماحول پیدا ہوا۔ انسان انسان کا دشمن بنا ۔ لاکھوں انسان زندہ جل گئے ۔ اس آزادی سے پہلے یہاں کے ان ہی لاکھوں انسانوں نے مل کر آزادی حاصل کی تھی ۔ اور آزادی کے بعد ان ہی لوگوں کو اپنی جان گنوانی پڑی۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے 1947ء کی آزادی کو اشارتاً پیش کرنے کی فلسفیانہ انداز میں کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بڑی ذہین قلم کار تھیں انہوں نے آزادی اور تقسیم کے واقعات سے متاثر ہو کر

ایک نہیں تین تین ناول تخلیق کئے اور ان سب ناولوں میں کہیں نہ کہیں مٹتی ہوئی تہذیب، مٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ملک تقسیم اور فسادات کو موضوع بنایا ہے ۔ اور یہی وجہ رہی کہ وہ آزادی کو کبھی گوتم کی زبانی ،کبھی ابومنصور کمال الدین کی زبانی اور پھر کبھی سرل ایشلے کی زبان اس پر تبصرہ کرتی ہوئی نظر آتیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے سے بہت محبت واخوت تھی اوراس تہذیب کو وہ اپنے سامنے مٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور یہی وجہ ہے دہلی کی وہ عملی سطح پر تو کچھ کر نہیں سکتی تھی مگر اپنی قلم کے ذریعے انہوں نے اس مٹتی ہوئی تہذیب کی شدید الفاظ میں مذمت کیں۔ اس تہذیب کو ایک تو ہندوستانیوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بگاڑا اور دوسرا انگریزوں نے یہاں جو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide and role) کی پالیسی اپنائی اس سے یہاں کی تہذیب یہاں کے بھائی چارے اور قومی یکجہتی کو بہت نقصان پہنچا۔ انگریزوں نے یہاں جبر کی حکومت کیں یہاں طرح طرح سے ظلم وستم ڈھائے اس کو بھی قرۃ العین حیدر نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''اس نے دور سے اپنی نقرائی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی، ''ابو المونشور اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ!''
اس نے کہا......
بھوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کس قدر سخت جان لوگ ہیں۔ اس نے سوچا ۔ابھی

چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑھا تھا۔ دریاؤں
میں اتنے طوفان آتے ہیں۔ وبائیں پھیلتی ہیں مگری ہ لوگ اسی
بے حیائی سے جیتے جاتے ہیں ۔ حد ہے واقعی ۔ اس نے گھڑی
دیکھی ۔''۱۲

دوسری جگہ آگے قرۃ العین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

''آٹھ جون ۱۷۹۸ء ۔ سرل ایک بیگ چونک اٹھا ۔ اسے
ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہوگئے تھے۔ان پانچ
سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔نیل کی تجارت دن دونی
رات چوگنی ترقی کررہی تھی۔ گجرات کی نیل کی صنعت دم توڑ چکی
تھی۔ اس کی جگہ کمپنی نے انگریز پلانٹر دہلی سے بنگال تک پھیل
چکے تھے ۔ بنگال کا کسان انگریز پلانٹر سے قرض لے کر نیل بوتا تھا
اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔عدالتوں
میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ انصاف کرنے والے خود ان
پلانٹرز کے بھائی بند تھے ۔''۱۳

قرۃ العین حیدر نے مثالوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز ہمارے ملک ہندوستان میں حکومت کرنے نہیں بلکہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور جب انہوں نے یہاں پایا کہ حکمران طبقہ کمزور ہے آپسی لڑائیاں ہماری ختم نہیں ہوتی تو انہوں نے آہستہ آہستہ یہاں حکومت میں دلچسپیاں لینی شرع کیں اور بھرحکمران بن بیٹھے اور پھر

آہستہ آہستہ یہاں کی قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے میں خلل ڈالا۔ یہاں مظالم ڈھائے ۔جانوروں کا سا سلوک انسانوں کے ساتھ روا رکھا۔اقتصادی طور پر ملک کو اور قوم کو کمزور کیا۔ یہاں وہ تو دن رات ترقی کرتے تھے مگر یہاں کے لوگوں کا خون چوستے تھے ۔انہوں نے کبھی یہاں یہ نہیں سوچا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان بلکہ یکساں ظلم وجبر ڈھاتے رہے ۔کاشتکار دن بدن غریب ہوتے جارے تھے ظاہر ہے کہ جب یہ سب کچھ ہمارے سماج میں ہوتا ہے تو ایک ادیب اوراس کی تحریریں ان سب باتوں کوتحریر کیے بنا نہیں رہ سکتی اور یہی معاملہ قرۃ العین حیدر کا بھی ہے کہ انہوں نے آزادی سے پہلے جو انگریزوں کے ظلم عوام پر ڈھائے گئے وہ سب پر یکساں تھے چاہے وہ ہندو ہو یا پھر مسلم انہوں نے کسی قوم کو نہیں بخشا اور یہی آپسی چارے کی یہ مثال بھی ہے کہ یہاں کہ ہندو پر اگر ظلم ہوئے تو مسلمان بھائی کبھی خوش نہیں ہوئے اور اگر مسلمان بھائی پر کوئی ظلم ہوا تو ہندو بھائی کبھی خوش نہیں ہوا۔

یہاں ہمارے ملک میں مشترکہ تہوار، ہولی،عید، دیوالی ،راکھی ان سب تہواروں میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی جو مثالیں ہمیں قرۃ العین حیدر نے پیش کیں ہیں وہ کسی دوسرے ادیب کے ہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین یوں رقمطراز ہیں:۔

> '' جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں شوالے اورگھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میرے دوست لیلہ بھارگوا کے۔''[۱۴]

یہاں کے لوگ امن پسند ہیں۔ یہاں باہر کے حملہ آوروں نے آ کر ہمیشہ سے ہندوستان کو لوٹا اور حکومت کی مگر یہاں کے ہندوستانیوں نے کبھی کسی ملک یا علاقے میں جا کر لڑائی ، لوٹ ،کھسوٹ کبھی نہیں کی ۔اس بات کو بھی قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی دور میں جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے تھے مگر ان کے ساتھ جو صوفیاء اکرام آئے انہوں نے عوام و خاص کو اپنے علم و ہنر سے یکساں فائدہ پہنچانے کی کوشش کی اور یہی وجہ رہی کہ وہ اسلام کی بھی تبلیغ کرتے تھے اور بہت حد تک وہ کامیاب ہوئے ۔ یہاں بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے اور یہاں ایک مشترکہ کلچر کی بنیاد پڑی اور آگے چل کر یہی لوگ قومی یکجہتی اور آپسی چارے کے عناصر بنے۔ عہد مغلیہ میں بھی قومی یکجہتی کے عناصر کو قرۃ العین حیدر نے جہاں اپنی تمام تخلیقات میں برتا ہے

ہندو مسلم اتحاد کی ایک مثال ہمارے ملک میں یہ رہی ہے کہ یہاں ہندو مسلم آبادی الگ الگ نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ محلے الگ ہیں مگر آبادی ملی جلی ہے ۔ ہر محلے اور گاؤں میں اپنے اپنے مندر اور مسجدیں ہیں۔ اور کہیں کہیں ہمیں ہندو محلے میں مسجد اور مسلمان محلے میں مندر ملیں گے یہ قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر ہمیں صرف ہندوستان میں ملیں گے ۔ اور جن کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں برتا ہے ۔قرۃ العین حیدر نے حالانکہ یہ اپنے سوانح ناول لکھے مگر وہ خود مشترکہ تہذیب کی دلدادہ تھی لہٰذا ان کی پرورش سے لے کر ان کی جوانی اور پھر بوڑھاپے تک وہ اس تہذیب کی آبیاری

کرتی رہی جس میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر تھے۔ مگر جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے یہاں کے مشترکہ تہذیب کو کافی حد تک نقصان پہنچایا۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے دور عہد میں کوٹھیوں کی جگہ محل ہوتے تھے۔ اور جب انگریزی یہاں آئے تو انہوں نے ان محلوں کو گرانے کا کام شروع کیا اور کوٹھیاں تعمیر کروانی شروع کیں۔

ہمارے قوم کو ملک ہندوستان بہت عزیز رہا ہے اور ہے بھی اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ یہاں سے جو لوگ بیرونِ ممالک گئے چاہے وہ تھوڑے دنوں کے لئے گئے یا پھر ہجرت کر کے اور کچھ سیر وتفریح کے لئے مگر وطن ہندوستان کی یاد کبھی ان کے دل سے نہیں گئی۔ اس کی ایک جیتی جاگتی مثال تقسیم کے وقت کی ہے جب پاکستان بنا اور یہاں کے مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں کے ہندو یہاں ہندوستان میں آ کر بسے مگر جب تک وہ لوگ زندہ ہے، اپنی جگہ جنم بھومی ان کو بہت عزیز رہی اور اس آس میں وہ جیتے رہے کہ ہوسکتا ہے ہم دوبارہ اپنے اپنے ملک میں واپس جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر کوئی اپنی اس دھرتی کا ملا تو اس سے اپنی جنم بھومی کے بارے میں تفصیل سے پوچھنا اس سے گھنٹوں تفصیل جاننا۔ وہاں کے کھیتوں وہاں کے درختوں وہاں کے پڑوسیوں کے بارے میں جاننا اپنا فرض سمجھتے

صدیوں سے ہمارے ملک میں ایسے کردار موجود رہے ہیں جو ہمیشہ مذہب وملت سے ہٹ کر قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اور انہیں کرداروں میں سے قرۃ العین حیدر کا ایک کردار اقبال بخت ہے۔ وہ مذہب میں یقین کم اور انسانیت

میں یقین زیادہ رکھتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ اقبال جیسے کردار آپ کو اور کہیں کم مگر ہمارے ملک ہماری تہذیب میں بہت ملیں گیں جن کو وقتاً فو قتاً ہمارے ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنی اپنی تخلیقات میں جگہ دی اور آپسی بھائی چارے اور قومی یکجہتی کی مثالیں پیش کیں ہیں۔

اقبال بخت کی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ غازی پور کے گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ جب ایک میچ کے دوران کھلاڑیوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ کھلاڑی زخمی ہوتے ہیں اور اقبال بخت زخمی کھلاڑی کے گھر جا کر ان کی والدین کی منت سماجت کچھ اس طرح کرتا ہے :۔

''صاحب! آپ کے صاحب زادے ہمارے اسکول میں میچ کھیلنے آئے تھے ان کو تھوڑی سی چوٹ آئی ہے کیونکہ کھیل کھیل میں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا نام اقبال بخت ہے۔ میں ....خوش بخت کا لڑکا ہوں، جو سٹی کورٹ میں مختار ہیں ۔آپ سے میری درخواست ہے کہ ہمارا اسکول بند کرنے کا حکم نہ دیں اور لڑکوں پر جرمانہ بھی نہ کریں کیونکہ ایک تو ہمار امتحان ہونے والے میں اور دوسرے ہمارے لڑکے بہت غریب ہیں۔''

ابا جان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وراس کی مدلل اور پر اعتماد تقریر سن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوئے ۔انھوں نے اسے بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔''۱۵؎

یہاں سے اقبال بخت کی بھائی چارگی شروع ہوتی ہے یہاں وہ نہ تو کھیل رہا تھا اور نہ ہی اس نے زخمی کیا تھا بلکہ کھلاڑیوں کے تئیں اس کی ہمدردی تھی جو وہ زخمی لڑکے کو لے کر اس کے گھر تک گیا اور اس کے والد کی منت سماجت کرنے لگا کہ اس لڑکے کے زخمی ہونے پر کوئی ردعمل نہ کیا جائے ۔ اس کے بعد اقبال بخت ہمیشہ منی کے گھر آتے اور اس کو پیار سے منی بلاتے حالانکہ منی کو اس نام سے شروع شروع میں چڑھ بھی ہوتی مگر آہستہ آہستہ اقبال سے منی کی دوستی بھی ہوگئی۔ حالانکہ اقبال ایک غیر مسلم نو جوان ہے مگر یہاں قرۃ العین حیدر نے اقبال بخت کے کردار کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اس سے کسی بھی مسلم کو کبھی نفرت نہیں ہوتی بلکہ ایک اچھا انسان ہی سب کے لئے ثابت کیا ۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے 'قلندر'' میں قومی یکجہتی کی ایک مثال منی کے گھر میں جب سب اکٹھے بیٹھتے ہیں کچھ اس طرح سے دی ہے کہ وہ اب اقبال بخت نہیں بلکہ اقبال بھائی اقبال میاں ، اقبال بھیا ہے۔

''اب وہ سارے گھر کے لئے ''اقبال میاں'' اقبال بھائی ، اور اقبال بھیا بن چکے تھے ۔ پہلو کے لان پر املتاس کا بڑا درخت ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سائے میں کھاٹ بچھا کر فرصت کے اوقات میں محفل جمتی تھی۔ اس کی صدارت ڈراوَر صاحب کرتے تھے ۔ نائب صدر اقبال بھائی خود بخود بن جاتے تھے۔ اس محفل کے دوسرے اراکین استاد یوسف خان ، جمنا پانڈے مہاراج چپراسی ، عبدل بیر اور بھائی تھے میں بن بلائے

مہمان کی حیثیت سے اِدھر اُدھر ہلگی رہتی تھی۔"۱۶؎

اقبال جب اس گھر میں پہلی بار آئے تھے تو اقبال بخت تھے مگر قرۃ العین حیدر نے بتایا کہ ہماری قومی یکجہتی جیسی اور آپسی بھائی چارگی کی وجہ سے وہ کس طرح اقبال بھائی اور اقبال بھیا بن گئے ۔ اوراس گھر میں ایک محفل سجی تھی اس میں کس طرح ہر مذہب کے لوگ محفل میں موجود ہوتے ہیں ۔ بغیر مذہب وملت سب مل جل کرر ہتے تھے ۔ اس محفل میں عبدل بھی ہے جمنا پانڈے بھی ہے اقبال بھی ہے اوراستاد یوسف بھی ہیں کس طرح اس محفل کے ارکان میں سبھی قوموں کے لوگ موجودر ہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشترکہ تہذیب جو ہمیں ورثے میں ملی ہے اس کے عناصر قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ انہوں نے مشترکہ کرداروں کا اپنی تخلیقات میں استعمال کر کے قومی یکجہتی ااور آپسی بھائی چارے کی مثالیں پیش کی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی کچھ تحقیقات کا تانا بانا مغل عہد سے لیکر جنگ آزادی تک کو بتایا ہے کہ کس طرح ایک خوشحال ملک کو بربادی کے دھانے تک لے جایا گیا۔ یہاں ہندو مسلم سکھ سب مل جل کرر ہتے تھے۔ یہاں قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کی مثالیں تھی مگر جب انگریز یہاں آتے تو انہوں نے کس طرح اپنی پالیسی پھوٹ ڈالو اورحکومت کرو کی پالیسی اپنالی اس سے ہندوستانی قوم کو بہت نقصان پہنچا۔قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے کی جومثالیں ہمیں اپنے ملک ہندوستان میں ملتی تھی اس کوکس طرح زک پہنچائی گئی۔ قرۃ العین حیدر نے شعوری اورغیر شعور طور پر مغل حکمران اکبر اورانگریزی ملکہ ملکہ الزبتھ اول کی روح کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مغل عہد میں قومی

یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی قائم تھی۔ قرۃ العین حیدر نے قومی غم اور موجودہ صدی کی بھاگ دوڑ زندگی ،سماج کا ہرطبقہ اس وقت گمراہ نظر آتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان تقسیم ،ہندو مسلم ،تعلیم ،ایسی جنگ ان سب چیزوں کو اس افسانے میں بتایا ہے ۔قومی یکجہتی کی ایک مثال قرۃ العین کی ایک مثال قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانے میں کچھ یوں پیش کیں ہیں:۔

''سکریٹری لندن سے زیادہ پررونق ہے ۔شاہی تقریبات اور جشن ، ہندو اور مسلم تہوار ، جلسے اور جلوس ، خوشحال متوسط طبقہ ،باکمال کاریگر ، علماء ،شعراء مدراس کے طالب علم ، اہل سیف اور تاجر اور منصب دار ، سادھو سنت اور صوفیاء وفقراء ......آگرہ سے سیکری تک راستے بھر بازار اور دوکانیں تھیں۔'' کا

قرۃ العین حیدر نے کس طرح قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں جو سولہویں صدی میں اکبر کے عہد میں تھیں دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ صدیوں سے ہمارے ملک میں مشترکہ تہذیب تھی۔ رشی منی اکٹھے بیٹھتے تھے صوفی سنت کس طرح بھائی چارگی قائم رکھتے تھے ۔کس طرح باکمال کاریگر اس ملک کی ترقی کے ستون تھے کوئی آپسی جھگڑا نہیں تھا۔کس طرح کا سیکولر قومی ملک ہمارا تھا اس کو قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں موضوع بنایا اور عوام وخواص اور میل ملاپ سے ملک ترقی کرتے ہیں۔ آج ہم جس سیکولرازم کی بات کرتے ہیں وہ سیکولرازم نہیں بلکہ ایک دھوکہ ہے

قرۃ العین حیدر چاہتی تھیں کہ ملک تقسیم نہ ہو اور قومی یکجہتی کے ساتھ سب ہندو مسلم

رہیں۔ مذہبی کٹرپن کو بہت ناپسند چیز تصور کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ ان سب باتوں کی مذمت کی جس سے قومی یکجہتی اورآپسی بھائی چارے پرآنچ آئے ۔لیکن انسان کو سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اس کے ذہنی تجربے ناقابل حصو ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ میری کہانیوں میں اچھی کردارنگاری نہیں ہوتی کیونکہ ہرانسان کے اندر کتنی تہ در تہ شخصیتیں ہیں کتنے پہلو، کتنے ان دیکھے اوراجنبی راز ہیں۔شاید اسی لئے وہ چوہدری محمد علی ردولوی کے خاکے''داستان طراز'' میں اودھ کے لئے جذباتی ہوکر یوں لکھتی ہیں کہ:

''اودھ ادب کی وہ بیک گراؤنڈ جس میں اودھ اور صوبہ جات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی زندگی کی ساری گہما گہمی موجود تھی ، اس کی جھلک ہمیں سرشار رسوا اوراودھ پنچ کے فائیلوں میں نظر آتی رہی ہے ۔ ان لوگوں کے ماضی میں طلسم ہوش ربا کی وہ داستانیں بھی تھیں جنہیں آغا مہر کی ڈیوڑھی والے اونچی داستان گومحفلوں میں سنایا کرتے تھے۔''۱۸

یہاں قرۃ العین نے اس دور کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب ہندوستان میں ہندومسلم سب ایک ساتھ مل جل کر اکٹھے دن کو دنیاوی کام کرتے تھے اوررات کو بیٹھ کر لمبی لمبی داستانیں سنا سنایا کرتے تھے۔ان کی تہذیب میں کسی قسم کی کوئی تفرقہ بازی نہیں تھیں کوئی دکھ درد ایسا نہیں تھا جو ان کا سانجھا نہ ہوا یک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں کی تہذیب سانجھی ہے اس ملک کا ماضی کتنا خوشحال تھا جب اودھ میں ہرطرف خوشحالی

اور رنگین خیالی کا دور تھا۔ لیکن اچانک زمانے نے کروٹ بدلی اور تہذیب میں تبدیلی آنے لگی جس کا قرۃ العین حیدر کو بہت دکھ تھا۔ ان کو اس تہذیب سے شدید جذباتی لگاؤ تھا۔ اور محمد علی دردلوی جن کی شخصیت پر قرۃ العین حیدر نے خاکہ لکھا ان کو بھی اس تہذیب سے بہت لگاؤ تھا جس کو اب آہستہ آہستہ مٹایا جارہا تھا۔ دن بدن عسائیت کا غلبہ، یورپ کا عروج، انگریزوں کی سلطنت کا اقبال، ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں قدم قدم پر یہ کشمکش اور تضاد ان لوگوں کو نظر آتے تھے۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہماری تہذیب کی دھجیاں اڑائی جارہی تھیں اس کا دکھ محمد علی دردلوی اور قرۃ العین حیدر دونوں کو تھا۔ جس کے متعلق مصنفہ یوں لکھتی ہیں:

''یہ زمانے جیسے کے میں نے عرض کیا۔ شدید جذباتی کشمکش کا وقت رہا ہوگا۔ اس زمانے کا ایک کلچر تھا جس نے لکھنؤ دہلی اور دوآبے کے علاقے کی ایک طرح قلعہ بندی سی کر رکھی تھی۔ ہیومنزم کی چند اقدار تھیں جنہوں نے اس خطے کے کلچر کو جنم دیا تھا اور جسے بیرونی مداخلت اور باہمی مذہبی آویزش نے مل جل کر بخوبی ختم کر دیا اور جس کا فائنل اور خوفناک نتیجہ ہم نے 1947ء میں دیکھ لیا۔ پھر ہمارا عوامی کلچر تھا جو ہم نے اپنے دیہاتوں اور اپنے قصبہ جات میں دیکھا تھا۔ اور جس کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان رویات پر رکھی گئی تھیں۔ اسی تہذیب اور اس اقدار کے ایک نام لیوا چوہدری محمد علی ہیں جن کے بارے میں میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔''[19]

غرض یہ کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے خاکوں میں بھی جہاں کسی شخصیت کے دوسرے کئی پہلوں پر لکھا وہی اس شخص کی مشترکہ تہذیب کی اقدار قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا چونکہ ہمارے ملک گنگ وجمن کے معاشرے کی بنیاد جس تضاد پر قائم تھی وہ طبقاتی تھا مذہبی نہیں تھا۔ ہمارے ان بزرگوں مثلاً پریم چند،محمد علی دونوں کے یہاں پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی موجود ہے۔اس پرانی تہذیب کی بہت سی باتوں سے یہ لوگ نالاں ہیں لیکن اس وابستگی کو چھوڑنے کیلئے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ۔لکھنؤ، دلی اور سارے اودھ کے اجڑنے کا انہیں شدید ذہنی جھٹکا اور روحانی تکلیف ہے ۔ردولی صاحب کے سبھی رشتہ دار پاکستان اور ملک سے باہر دوسرے کئی شہروں میں جاکر آباد ہوگئے ہیں اورکافی خوشحال بھی ہیں مگر ردولی صاحب ہیں کہ یہ جنم بھومی کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔

یہاں ہندو پاک میں یہ اردو والوں کی روایت رہی ہے کہ کے ان شعراء اور ادباء صوفی سنت سانجے رہے ہیں وہ میرؔ ہوں غالبؔ ہوں یا پھر اقبالؔ اور فیضؔ یہ سب اپنے اپنے دور کے بڑے شاعر مگر ہندو اور مسلم یکساں ان کے مداح ہیں کسی کو کسی پر سبقت حاصل نہیں اس کی مثال بھی قرۃ العین قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے لئے یوں دیتی ہیں:۔

> ''ایک اردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبالؔ اور فیضؔ پر سردھنتا ہے اس لاشعوری طور پر قبائلی تھرو بیک بھی کارفرما ہے جس طرح اہل پنجاب ہندو مسلمان اور سکھ فیضؔ صاحب کے شیدائی ہیں۔ یو۔پی ۔ بہار اور دہلی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہوکر کسی واحد ادبی

شخصیت کے لئے اس طرح کے والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے۔ کیونکہ وادی گنگا وجمن کی لسانی اورتہذیبی شنویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستس کی گنجائش نہیں اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جس کے متعلق ہندی اوراردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔''[20]

قرۃ العین حیدر کی اس قسم کی مثالیں دے کر ہمارے ملک وقوم میں ایک مشترکہ تہذیب کی جو روایت ہے اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئی ہیں یہ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے مگر انہوں نے قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کو متواتر اپنی تحریروں میں برتا ہے۔ حیدر نے جہاں کہیں بھی قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے حوالے سے بات ہوتی اس کی اس بات کو یا اس تحریر کو اپنی تخلیقات میں برتنے کی ضرور کوشش کی ہے ایک جگہ جہاں وہ عصمت چغتائی کا خاکہ تحریر کررہی ہیں وہاں سروجنی نائیڈو کا ذکر حالانکہ ضروری نہیں مگر ان کی نظم میں جس میں آپسی بھائی چارگی اور قوم یکجہتی کی بات ہے اس کو ضرور تحریر کرتی ہیں:۔

''۱۹۲۶ء میں عمر سبحانی کی وفات پر سروجنی نائیڈو نے ایک دلدوز نظم لکھی تھی۔ ''تم نہ میرے رشتہ دار تھے نہ ہم مذہب ،لیکن اپنے بادشاہوں جیسا دل رکھنے والے تم مجھے اپنے سگے بھائیوں سے زیاہ عزیز تھے۔ افسوس کہ میں جس نے ہمیشہ تمہاری خودداری غمگین تنہائی کا مذاق اڑانے والے خونخوار کرب کو کم کرنے کی کوشش کی میں ہی

تمہاری آخری مصیبت کے وقت تم سے دور تھی ۔ میں تمہارے مزار
کے پاس کھڑی تمہیں پکارتی ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔''[۲۱]

اس سے بڑھ کر اور قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر اور کیا ہوں گے کہ قرۃ العین حیدر عصمت کا خاکہ تحریر کرر رہی ہیں مگر سروجنی نائیڈو کی اس تحریر یا نظر کے ترجمے کو اس میں شامل کرتی ہیں جس میں قومی یکجہتی کے عناصر ہوں۔

قرۃ العین حیدر کی مسلمان قوم کے تعین اپنی محبت بہت زیادہ تھیں انہوں نے مسلمانوں کی بربادی ۱۹۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اجڑتے گھروں اور خاندانوں کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا اور خود بھی وہ اس تقسیم کا نشانہ بنیں اس سے بھی ان کے دل میں اپنی مسلمان قوم کے لئے جذبہ بڑا۔ اس تقسیم اور غدر کے بعد جب بھی کوئی مسلمان عرب یا کسی دوسرے ملک کا نظر آتا تو ان کے جذبات ہمیں نظر آنے لگتے ہیں ''لندن لیٹر'' میں ایک عرب کو دیکھ کر ان کے جذبات یوں سامنے آتے ہیں:

'' توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کررہا ہے...... بہر کیف تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ یہ میرے رسول اللہؐ اور میرے ائمہ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل صورت کے رہے ہوں گے ۔ یہی لباس پہنتے ہوں گے ۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امامؑ

> مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا میرے اوپر کافی جذباتیت کا موڑ طاری
> ہورہا ہے ۔عرب نے کولڈ ڈرنگ کا گلاس ہاتھ میں اٹھایا۔ میں اس
> سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی ۔کوکا کولا پیئو تو یاد
> کرو پیاس حسینؑ کی''۲۲

مصنفہ نے ہمیشہ قومی مفاد کی بات کی ہے چاہے وہ مذہبی سطح کی ہو یا پھر ملکی سطح کی مگر انہوں نے اپنی تمام تخلیقات اورتحریروں میں بھائی چارے کے عناصر ضرور پیدا کئے ہیں ۔اب مثال کے طور پر رپورتاژ میں مذہبی اورقومی یا ملکی بھائی چارگی کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھیں اگر وہ ان عناصر کو نہ بھی پیش کرتیں تب بھی فنی لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہ پڑتا مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے مفادات سے بڑھ کر ملکی اورمذہبی مفادات کی بات کی ہے۔ جب مصنفہ نے لندن میں ہمارے ملک ہندوستان کی کچھ چیزیں دیکھی تو ان کو بے حد صدمہ ہوا چونکہ وہ ہمارا تہذیبی خزانہ تھااوران ملکوں نے یہاں سے لوٹ کھسوٹ کر اپنے ملکوں میں ان چیزوں کو لئے گئے تھے۔

ہندوستان سے جتنے بھی لوگ باہر کے ملکوں میں گئے ہیں وہ اپنے تہوار ضرورمناتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں چاہے وہ عید ہو، ہولی ہو، دیوالی ہو یا پھر تلک جینتی اورتمام ہندوستانی پاکستانی اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ یہاں کے تہوار سانجے ہیں ۔ ہندو مسلم اکٹھے ہوکر ہر ایک تہوار مناتے ہیں۔ یہاں سے جتنے لوگ باہر کے ملکوں میں گئے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس رپورتاژ میں ایک خان صاحب کی مثال دی ہے جو پچھلے کئی سالوں سے لندن میں رہتے ہیں جو جوشؔ کے قریبی ہیں اوراپنی ذات میں انجمن

ہیں۔ بی بی سی کے اردو سیکشن میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی ۔ بہت لمبے عرصہ لندن میں رہنے کے باوجود ان کا لب ولہجہ ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا تھا۔ اردو بولنے میں ہمیشہ انھوں نے اودھ والوں کا سا لب ولہجہ رکھا۔ سنیما کو ہمیشہ انھوں نے بائیسکوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں وہ کہانیاں سناتے تھے ۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے کے لئے وہ برطانیہ گئے تھے اور اس کے بعد کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے ۔ ہائیڈ پارک میں انھوں نے بھی بغاوت کی آواز بلند کی تھی۔ لائیڈ پارک کے پاس پہنچ جاتے تھے اور اس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کے آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو فوراً ابھی آزاد کیجئے ۔ مصنفہ نے بتایا کہ خان صاحب کو وطن کتنا عزیز تھا مگر جب وہ وطن واپس آتے ہیں تو وہ ملک اب ہندوستان نہیں رہا بلکہ پاکستان نام سے دوسرا ملک قائم کیا گیا اوران کو وطن واپس نہیں جانے دیا گیا جس کو مصنفہ یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے ۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں ۔کوئی خاندان نہیں ہے ۔ اکیلے رہتے ہیں اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت چچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چوہدری محمد علی ردولوی کی حکایتوں میں اور چوہدری محمد علی کے قصوں کو بھی سمجھ کر

پڑھنے اور سر دھننے والے اب کم رہ گئے ہیں۔''۲۳؎

جس طرح منشی پریم چند کو اردو والے اور ہندی والے اپنا مشترکہ ادیب مانتے ہیں اسی طرح ٹیگور اور گاندھی کی بھی بہت عزت اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان شخصیات کو بھی بڑی قدر اور عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔مشرقی ہندوستان کے ایک بنگالی مسلمان ٹیگور کے متعلق یوں کہتے ہیں:۔

''میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا۔ ٹیگور کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟''

''جی ؟''

''میرا مطلب ہے کہ ٹیگور بنگال کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس حساب سے ٹیگور بھی پاکستانی شاعر ہوا؟

''دیکھئے میں عرض کردوں۔میں نے گلا صاف کیا ۔ آپ نذرالاسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں ۔جس غریب کو پاکستان کے وجود کی بھی خبر نہیں اور کلکتہ میں پڑا زندگی کے دن پورے کرر ہاہے تو پھر ٹیگور کو آپ پاکستانی شاعر کیوں نہیں مانتے جب کے آپ کو مغربی پاکستان کے ہر گھر میں قائداعظم کے ساتھ ساتھ ٹیگور کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے مارے اخلاق ٹیگور کے متعلق آپ

سے بات کی تو آپ خاموش ہو گئے ۔ اور وہ بے حد کھسیانا ہوا ۔
سوال یہ ہے کہ کلچر کی تقسیم کے بعد ٹیگور اور اقبالؔ جیسی عظیم بین الاقوامی ہستیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے ۔'' ۲۴؎

غرض یہ کہ ہماری تہذیب مشترکہ نہیں بلکہ ہماری تہذیبی ہستیاں بھی مشترکہ ہیں ۔ ملک تقسیم ہوا ہم نے ملک کو تقسیم کیا مگر تہذیب کو تقسیم نہیں کر سکے ہماری قوم میں بہت سی چیزیں مشترکہ ہیں جس کی وجہ سے ہماری قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارہ قائم ہے اور جس کی مثالیں قرۃ العین حیدر نے جابجا اپنی رپورتاژ میں بھی پیش کیں ہیں۔''ستمبر کا چاند'' میں ایک جگہ انسانیت کا پرچار اس طرح کرتی ہیں ایک ڈاکٹر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں ، ان کے دکھ ، تکلیف ، مسرتیں ! انسان محبت کرتا ہے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان مرتا ہے ۔ ان سطور میں کس طرح انسانی محبت واخوت کا پیغام حیدر نے دیا ہے۔

ان سب مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی زیادہ تر تخلیقات میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے عناصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ اور ان عناصر کو پیش کرنے کا حیدر کا مقصد آپسی بھائی چارگی کو پھیلانا اور از سر نو زندہ کرنا ہے ۔ انسانی قتل وغارت اور نفرت کا بیج جو ہماری ہندوستانی قوم میں پیدا کیا گیا ہے اس کو کسی حد تک کم کرنا اور وہ چاہتی تھی کہ ہماری مشترکہ تہذیب جس کی جڑیں ہماری سب کی مشترکہ ہیں سب قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارگی کے ساتھ مل جل کر رہیں۔

حواشی

۱۔ میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر لاہور سنگ میل پبلی کیشنز۔ ص، ۲۰۲
۲۔ ایضاً ص، ۲۵
۳۔ ایضاً ص، ۱۸۱
۴۔ ایضاً ص، ۲۸۲
۵۔ ایضاً ص، ۴۵۳
۶۔ ایضاً ص، ۳۶۷
۷۔ سفینۂ غمِ دل قرۃ العین حیدر لاہور سنگ میل پبلی کیشنز۔ ص، ۱۰
۸۔ ایضاً ص، ۴
۹۔ ایضاً ص، ۲۳
۱۰۔ ایضاً ص، ۳۲۰
۱۱۔ آگ کا دریا قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص، ۸۵
۱۲۔ ایضاً ص، ۱۸۱،۱۸۰
۱۳۔ ایضاً ص، ۱۸۱
۱۴۔ ایضاً ص، ۳۴۴

۱۵؎ پت جھڑ کی آواز قرۃ العین حیدر قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی ص، ۱۴۴

۱۶۔ ایضاً ص، ۱۴۵

۱۷؎ روشنی کی رفتار قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ص،۹۴

۱۸؎ داستان طراز قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص، ۵۷

۱۹؎ ایضاً ص، ۵۸

۲۰؎ ایضاً ص، ۱۳۳

۲۱؎ ایضاً ص، ۱۷۱

۲۲؎ ستمبر کا چاند قرۃ العین حیدر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص،۱۶

۲۳؎ ایضاً ص، ۴۸

۲؎ ایضاً ص، ۴۸

کتابیات (بنیادی ماخذ)

نمبر شمار	مصنف و مرتب	نام کتاب	سن اشاعت	پبلشر
۱۔	قرۃ العین حیدر	میرے بھی صنم خانے	۲۰۰۰ء	لاہور سنگ میل پبلی کیشنز
۲۔	قرۃ العین حیدر	سفینۂ غم دل	۲۰۰۵ء	// //
۳۔	قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا	۲۰۱۳ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۴۔	قرۃ العین حیدر	کار جہاں دراز ہے (اوّل)	۲۰۰۳ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۵۔	قرۃ العین حیدر	کار جہاں دراز ہے (دوم)	۲۰۰۳ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۶۔	قرۃ العین حیدر	آخر شب کے ہمسفر	۱۹۹۸ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
۷۔	قرۃ العین حیدر	گردش رنگ چمن	۱۹۸۳ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۸۔	قرۃ العین حیدر	چاندنی بیگم	۱۹۹۳ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۹۔	قرۃ العین حیدر	چار ناولٹ	۲۰۱۰ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
۱۰۔	قرۃ العین حیدر	ستاروں سے آگے	۲۰۰۸ء	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۱۱۔	قرۃ العین حیدر	شیشے کے گھر	۲۰۰۷ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۱۲۔	قرۃ العین حیدر	پت جھڑ کی آواز	۲۰۱۱ء	قومی کونسل برائے فروغ اُردو، دہلی
۱۳۔	قرۃ العین حیدر	روشنی کی رفتار	۲۰۰۰ء	ایجوکیشنل باک ہاؤس، علی گڑھ

۱۴۔ قرۃ العین حیدر ستمبر کا چاند ۲۰۰۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۵۔ قرۃ العین حیدر کوہ دماوند ۲۰۰۹ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۶۔ قرۃ العین حیدر داستان طرز ۲۰۰۸ء // // //

۱۷۔ قرۃ العین حیدر پکچر گیلری ۲۰۰۴ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۸۔ قرۃ العین حیدر آئینہ نما ۲۰۰۹ء // // //

۱۹۔ ڈاکٹر مجیب احمد خان گل صد برگ ۲۰۰۶ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ثانوی ماخذ

۱۔ احمد طارق جدید اردو افسانے میں سماجی وثقافتی جہات ۲۰۰۶ء ادارہ نیا سفر۔الہ آباد

۲۔ انوار الحق چاندنی بیگم (ایک جائزہ) ۲۰۰۷ء ایم آر پبلی کیشنز

۳۔ پروفیسر عبد المغنی قرۃ العین حیدر کا فن ۱۹۹۴ء ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۴۔ پروفیسر نور الحسن نقوی تاریخ ادب اردو ۲۰۱۲ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۵۔ جمیل اختر زندگی نامہ ۲۰۱۴ء سیمانت پرکاش، دہلی

۶۔ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار ۲۰۰۶ء سیمانت پرکاش، دہلی

۷۔ ڈاکٹر شہاب عنایت ملک گردن رنگ چمن (ایک تنقیدی مطالعہ) ۲۰۰۷ء ڈائمنڈ بک ہاؤس، جموں

۸۔ ڈاکٹر زرنگار یاسمین قرۃ العین حید کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ ۲۰۱۲ء ایس ایچ آفیسٹ پرنٹرس، دہلی

۹۔ ڈاکٹر اسلم آزاد اردو ناول آزادی کے بعد ۲۰۰۶ء اردو بک سوسائٹی، دہلی

۱۰۔ ڈاکٹر سنبل نگار اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ ۲۰۱۲ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۱۱۔ ڈاکٹر مجیب احمد خان قرۃ العین حیدر ذات وصفات ۲۰۰۸ء کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

۱۲۔ ڈاکٹر ارتضی کریم قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ ۲۰۰۹ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۳۔ ڈاکٹر شیفتہ پروین — قرۃ العین حیدر فکر و فن (افسانوں کی درستی میں) — ۲۰۰۹ء — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۱۴۔ ڈاکٹر اسلم آزاد — قرۃ العین حیدر بحیثیت ناول نگار — ۲۰۰۴ء — سیمانت پرکاش۔ دہلی

۱۵۔ ڈاکٹر کامل قریشی — اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب — ۲۰۱۴ء — اردو اکیڈمی۔ دہلی

۱۶۔ ڈاکٹر منظر اعجاز — اقبال اور قومی یکجہتی — ۱۹۹۴ء — شوبی آفسیٹ پریس، دہلی

۱۷۔ سید مجاور حسین — اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر — ۱۹۸۵ء — اتر پردیش اردو اکیڈمی

۱۸۔ عبدالسلام — قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن — ۱۹۸۵ء — 〃 〃

۱۹۔ گل صبا — قرۃ العین حیدر کے ابتدائی تین ناول — ۲۰۰۸ء — شاہد پبلی کیشنز، دہلی

۲۰۔ محمد غیاث الدین — فرقہ واریت اور اردو ناول — ۲۰۰۵ء — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۲۱۔ ہربنس سنگھ تصور — قرۃ العین حیدر ادب عہد اور حیات — ۲۰۱۳ء — ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی